اُجالا

قیسی رامپوری

لاہور اکیڈمی

۲۰۵۔ سرکلر روڈ، لاہور ۲

بار اول ۔ ۔ ۔ ۔ اکتوبر سنہ ۱۹۵۹ء

قیمت ساڑھے سات روپے

ناشر :- ایس ایم کھوکھر

طابع :- اردو پریس لاہور

کچھ تجھ کو خبر ہے کہ غمِ نیم شبی میں
میں تیری عنایت کے سہارے ہی جیا تھا
وحشت کے بیابان میں مری تشنہ لبی نے
انعام میں یک قطرۂ شبنم ہی پیا تھا

وطن کے سب سے بڑے سپاہی
کے نام جو اپنی بہادر جماعت اور
وفادار رفقا کو لے کر خاموشی سے اٹھا
اور جس نے باطل اقتدار کو کچل کر جیسے
ایک نیا ملک فتح کر لیا ۔

قیسی رامپوری

انسان کے لئے تاریخ سب سے بڑی رہبر و معلّم ہے جن اقوام کے حصے میں خوش قسمتی سے زرّیں تاریخ آئی ہے۔ اس کی روشنی و رہبری میں وہ زبردست ترقی کر سکتی ہیں۔ جیسے قوم مسلم جس کی تاریخ کو زمانہ کبھی مٹا نہ سکا اور نہ مٹ سکے گا۔ اگر یہ تاریخ کبھی مٹی تو خود مسلمانوں ہی کے ہاتھوں مٹے گی جس کی مثال میں پاکستان کے پچھلے آٹھ نو سال کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

میں نے اس ناول میں سرسری طور پر ملک کے انہی آٹھ نو تاریک سال کو لیا ہے اور دعا کرتا ہوں کہ یہ دَورِ جاہلیت ہماری تاریخ میں جگہ نہ پا سکے۔ اگرچہ کسی قوم کا بُرا زمانہ بھی آئندہ نسل کیلئے وجۂ عبرت و سبق آموز ہوتا ہے۔

ہمارا گذشتہ یہ بُرا دَور ہر چند تاریخ کی زبان میں مختصر ہی تھا۔ پھر بھی وہ تھا اس قدر شدید کہ اگر اسے صدیوں پر پھیلا دیا جائے تو وہ صدیاں بھی کالی ہو جائیں گی۔

قصّہ مختصر یہ کہ آئندہ خواہ کسی قسم کا نظامِ مملکت قائم ہو اور چاہے کیسا ہی آئین بنے مگر اس کے سامنے ان آٹھ نو سال کی سیاہ پٹی ضرور رہنا چاہیئے۔ اسی سے ہم ان گڑھوں سے بچتے ہوئے گزر سکتے ہیں جس کے اندر پوری قوم کی لاشیں سڑنے لگی تھیں۔

قیسی رامپوری

بجلی کی روشنی سے نمائش بُقعہ نور بنی ہوئی تھی۔

ادھر قمقمے اودھر قمقمے، چپے چپے پر قمقمے روشن تھے۔ اب یہ معلوم نہیں کہ یہ قمقموں کی روشنی تھی یا پریزادیاں نمائش گاہ کے حسن کی کرنیں تھیں جس میں ہر طرف اُجالا پھیلا ہوا تھا۔

عورتوں کے پرے کے پرے نمائش میں چلے آرہے تھے جن عورتوں کو ابھی

اے تماشہ گاہِ عالم روئے تو۔

کا احساس نہ ہو، وہ برقعوں اور چادروں میں لپٹی ہوئی تھیں ورنہ بیشتر

عورتیں بڑے ٹھاٹ سے نمائش میں داخل ہوئی تھیں۔

زرق برق ساڑھیاں، جگمگاتے زیورات، قیمتی کاریں یہ سب کچھ خدا جانے ان کے پاس کہاں سے آیا تھا، کچھ پتہ نہیں کہ ان کے ذرائع آمدنی کیا تھے۔ اُن کے شوہر، باپ، بھائی کیا کام کرتے تھے۔ ملک کی کس عظیم خدمت کے صلہ میں انہیں یہ دولت ملی تھی یا اس کے برعکس سوشیل، کمرشیل اور پولٹیکل وغیرہ کی کونسی تاخت کے سلسلہ میں ان عورتوں اور مردوں کو یہ امارت حاصل ہوئی تھی؟

بڑی بڑی جگمگاتی دُکانیں اور عظیم الشان چمکتے ہوئے اسٹال کیا کچھ پیش نہیں کر رہے تھے۔ ان میں کیا نہ تھا۔ سوئی سے لے کر ہوائی جہاز تک کے پُرزے، مو باف سے لے کر زربفت و کمخواب کے تھان تک موجود تھے۔ غرض ہر کام، ہر مصرف کی چیز نمائش میں نظر آ رہی تھی۔

مگر ان انواع و اقسام کی چیزوں کو ہاتھ لگاتے ڈر لگتا تھا۔ کسی کو چھوؤ تو یہ معلوم ہوتا تھا جیسے ہاتھ میں ڈنک لگ گیا۔

ہر چیز کے دام بیحد اونچے تھے۔

بجلی سے جگمگاتی نمائش میں بلیک مارکیٹ کی گرم بازاری زوروں پر تھی۔

مگر اس پر بھی یہ ہولناک گراں اشیاء بک رہی تھیں ، خریدی جا رہی تھیں۔ کیونکہ لوگوں کے پاس کافی سے زیادہ روپیہ تھا۔ یہ پیسہ اُن کے پاس کہاں سے آیا؟

اس قلم کے کیا دام ہیں؟

پچیس روپے۔

پچیس روپے ادا کر کے قلم خرید لیا گیا اور دوسری دُکان پہ لے جا کر رکھ دیا گیا۔

کیوں میاں یہ قلم کتنے کا ہوگا؟

چالیس روپے کا ہے صاحب! آپ جیسے قدر دانوں ہی کے لئے منگوایا ہے میں نے۔

پینتیس روپے لوگے؟

صاحب جھوٹ بولنے والے پر لعنت۔ آپ سے زیادہ پیسے لے کر میں کون سا مالدار ہو جاؤں گا۔ تجارت ایمانداری کی۔

چنانچہ پچیس روپے کا قلم پینتیس روپے میں فروخت کر دیا گیا۔

ایک چائے تو بھیجو میاں ہوٹل والے۔

چائے آگئی۔

کتنے پیسے ؟

تین آنے ۔

غضب خدا کا ۔ ایک آنے یا چھ پیسے کی چائے کے تین آنے !

شکر بلیک سے لینی پڑتی ہے ۔

تین آنے ادا کرنے پڑے ۔

رکشا والے ! جہانگیر روڈ تک کا کیا لوگے ؟

ایک روپیہ دے دینا بابوجی !

رکشا والے سے گفتگو بیلہ ہاؤس پر ہوئی ، جہاں سے پونے میل کے قریب ہے ۔

ہائیں ! چھ آنے کے بجائے ایک روپیہ !

رکشا والے کو بھی تو اپنی رکشا کا سامان مہنگا لینا پڑتا تھا ۔ اسے بھی چائے ، سگریٹ ، بیڑی وغیرہ کے زیادہ پیسے دینے پڑتے تھے ۔

غرض یہ ایک چکر تھا جو بڑے شہروں ہی تک محدود نہ تھا بلکہ قصبات و دیہات تک اس کی زد میں آئے ہوئے تھے ۔ بلیک مارکیٹ سے لاکھوں آدمی پل رہے تھے ۔

اسے ہر چیز کا لائسنس ملا ہوا تھا۔

مثلاً اس نے ابتدائی جماعتوں میں ایک دو بار چوری کا ارتکاب کیا تھا مگر بات رفت گذشت کر دی گئی تھی۔

جوان ہونے سے قبل ہی اس نے لڑکیوں کا تعاقب شروع کر دیا تھا لیکن اس کے اس فعل کو کوئی ایسی اہمیت نہیں دی گئی تھی۔

سستی پنسل یا قلم خرید کر وہ کبھی زیادہ داموں میں اپنی کلاس کے لڑکوں کے ہاتھ فروخت کر دیتا تھا تو اسے بچپن کی شرارتوں پر محمول کر کے نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔

آخر وہ شریف کا بیٹا تھا اور شرافت اس کے مکان کی موری سے نکلی تھی۔

عبید! تیرے پاس کچھ پیسے ہیں؟

اس کے ساتھی فرید نے ایک دن اس سے نمائش میں دریافت کیا۔

عبید نے پوچھا۔

زیادہ نہیں ہیں۔ کتنے چاہئیں تجھے؟

فرید نے جواب دیا۔

یہی تیس روپے کی ضرورت تھی۔ چھوٹی بہن کے لیے چند چیزیں خریدنا تھیں۔

عبید نے کہا۔

اپنے پاس تو بھیا پانچ روپے پڑے ہیں جیب میں۔

فرید نے کہا۔

پانچ روپے سے کیا ہوگا۔ ویسے ہی یہاں ہر چیز مہنگی ملتی ہے۔

عبید نے کہا۔

اچھا گھبراؤ نہیں۔ دیکھو قسمت آزمائی کرتا ہوں۔

فرید بولا۔

کیا قسمت آزمائی کرے گا۔ مجھے بھی تو بتا۔

عبید نے مسکرا کر کہا۔

تجھے آم کھانے سے کام ہے یا پیڑ گننے سے اور چوڑیوں کی ایک دکان کے قریب پہنچا۔

عورت یہاں بھی اپنی عام کمزوری کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اسے کسی بھی زینت کی جگہ لے جاؤ، وہ للچائے بغیر نہیں رہے گی۔

عبید نے کہا۔

واہ واہ کتنی خوبصورت سی کلائیاں ہیں۔
وہ عورت تھی گداز اور اس کی عمر پینتیس سال سے کم ہو گی مگر اس نے رنگ بھبیہ کا پایا تھا۔
چالیس سال سے اوپر کے مرد ایسی ہی عورتوں پہ مرتے ہیں۔
دیکھنا ٹانگ برابر کا چھوکرا ہے۔ میری کلائیوں کا نظر لگا تا ہے۔
وہ گوری عورت اپنی ساتھی عورت سے بولی۔
چوڑیوں والا بھی مسکرانے لگا۔
چند منٹ بعد اس خوبصورت عورت نے پیسے دینے کو اپنا بٹوا ٹٹولا تو تمام نوٹ غائب تھے۔
وہ عورت چیخ کر بولی۔
اسے ہے وہ حرامی مجھے لوٹ لے گیا۔
چوڑی والے نے دریافت کیا۔
کیا ہوا بہن!
عورت نے جواب دیا۔
وہ لونڈا جو ابھی یہاں کھڑا تھا۔ اس نے میرے بٹوے پر ہاتھ

صاف کر دیا۔

چوڑی والے نے عورت کے شبہ کی تردید میں کہا۔

آپ بھی غضب کرتی ہیں۔ وہ ایک شریف آدمی کا لڑکا ہے۔ اسی نمائش میں اس کی ایک نہیں دو دو دکانیں ہیں۔

عورت نے کہا۔

وہ کسی کا بھی بیٹا ہو، وہ چور ہے۔ اس کے سوا اور کوئی میرے اتنے قریب نہیں آیا تھا۔

ایک عورت نے کہا۔

اچھی طرح دیکھو کسی اور جگہ تو رکھ کر نہیں بھول گئیں، یاد کرو۔ ممکن ہے تم نے اندر کچھ خریدا ہو یا کسی دوسری جگہ پیسے گر گئے ہوں۔

عورت اپنے خیال پر اَڑی رہی۔

میں مان نہیں سکتی۔ میں نے کچھ نہیں خریدا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ چند منٹ پہلے میرے بٹوے میں پیسے موجود تھے۔

اس اثناء میں عبید فرید کے پاس ایک چکر لگا کر پھر اس کی دکان کی طرف سے گزرا۔

چوڑی والے نے عبید کو آواز دے کر کہا۔

عبید میاں! یہاں آنا۔ یہ خاتون کیا کہہ رہی ہیں تمہارے متعلق؟
عبید نے ایک ہاتھ سے کسی چیز کا منہ میں پھنکا مارتے ہوئے پوچھا۔
کیا بات ہے؟
اس عورت نے آہستہ سے اس کا کان پکڑ کر دریافت کیا۔
سچ بتاؤ۔ تم نے میرے بٹوے میں سے نوٹ چرائے ہیں؟
عبید نے اس سے اپنا کان چھڑاتے ہوئے کہا۔
اوہو! تمہاری کلائیوں کی تعریف کرنا غضب ہو گیا چلو اس بار تمہاری آنکھوں کی تعریف کئے دیتا ہوں۔ وہ کالی کالی اور موٹی موٹی ہیں۔
عورت نے اپنے حُسن کی تعریف ایک نابالغ لڑکے تک سے سُن کر کہا۔
تم بہت شریف معلوم ہوتے ہو۔
اس نے پھر کہا۔
مگر میرا تمام تر شُبہ تم پر ہی ہے۔

عبیار نے مشخت کے طور پر کہا۔

واہ ! بڑی آئیں مجھ پر شبہ کرنے والی۔ ہمارے پاس کیا روپے کی کمی ہے۔ تمہارے پاس تو دس پندرہ روپے ہی ہوں گے۔ میں اپنی بڑی دکان پر سے کہو جتنا روپیہ تمہیں چاہیئے اُدھار دلا سکتا ہوں۔

اس خاتون نے کہا۔

دس پندرہ نہیں ، میرے پورے چالیس روپے غائب ہوئے ہیں۔

چوڑی والے نے اس سے کہا۔

بہن ! آپ لڑکے کے پیچھے کیا پڑ گئی ہیں۔ آپ نے کسی دوسری جگہ روپے گرا دیئے ہوں گے۔

اس دوران میں عبید پھر ٹرخ گیا اور فرید سے آ ملا۔

عبید نے مسکرا کر فرید سے کہا۔

کہو دوست ! کیسا ہاتھ صاف کیا ہے ؟

فرید بولا۔

بُرا کیا یار تُو نے۔ میں تیری اس حرکت کو پسند نہیں کرتا۔

جلید نے کہا۔

جا اب تجھے جو کچھ لینا ہے خرید لا۔ میں اپنی دکان پر تیرا انتظار کرتا ہوں۔

فرید نے کہا۔

چوری کرنے سے تو یہ بہتر تھا کہ تو اپنی دُکان سے مجھے تیس روپے قرض لا دیتا۔

جلید نے کہا۔

تو ادا کہاں سے کرتا۔ یہ روپیہ تو تجھے مفت میں پڑا ہے۔

اور اپنی دکان پر آ گیا۔

فرید خرید و فروخت کے لئے چلا گیا۔

نمائش میں جلید کے ماموں کی دُکان تھی اور ایک اس کے والد کی۔ وہ ماموں کی دکان پر پہنچا۔ اپنی دکان پر یوں نہیں گیا کہ وہاں اس کا والد ہو گا۔

چوری کے روپے میں سے اس نے پانچ روپے اپنے لئے رکھ لئے تھے۔ باقی سب فرید کو دے دیئے تھے۔ ان پانچ روپے میں سے اس نے ماموں کی دکان پر بیٹھے بیٹھے کچھ چائے اڑائی، کچھ مٹھائی لی۔

ماموں نے دریافت کیا۔
مٹھائی وغیرہ کے لئے تمہارے پاس پیسے کہاں سے آ
گئے عبید؟
عبید نے عادتاً جھوٹ بولا
ابّا سے لئے تھے۔
ماموں نے کہا۔
اچھا دیکھو۔ میں ذرا تمہارے والد کی اسٹال تک جاتا ہوں
تم یہیں رہنا۔ نوکر پر کان چھوڑ کر نہ چل دینا۔
ہو آئیے۔ میں جب تک فرید کا انتظار کرتا ہوں۔ کیا ابّا
اسٹال پر ہیں؟
ماموں نے جواب دیا۔
وہ یہاں کب آتے ہیں؟ اور چلا گیا۔

دس بارہ منٹ بعد فرید بھی آگیا مگر خالی ہاتھ تھا۔ اس نے کچھ نہیں خریدا۔ اس کا جی نہ چاہا کہ عبید نے جس روپے کو چوری سے حاصل کیا تھا، اسے اپنے کام میں لائے۔

عبید نے فرید سے دریافت کیا۔

ہیں! تم نے کچھ خریدا نہیں۔ خالی ہاتھ کیسے آگئے؟

فرید نے عبید کے چرائے ہوئے نوٹ نکالتے ہوئے کہا۔

سوچا کہ کل خرید لوں گا۔ لو یہ اپنے روپے۔

عبید نے اسے منع کرتے ہوئے کہا۔

ارے! یہ کیا حماقت کر رہے ہو؟ چھپا نے رکھو انہیں ابھی
ورنہ میرے پاس ماموں دیکھ لیں گے۔
فرید نے کہا۔
وہ عورت بھی ابھی نمائش ہی میں ہو گی۔ تم نے اس غریب کو کچھ
خریدنے سے محروم کر دیا۔
اور عبید کو روپے لوٹا دیئے۔
عبید نے کہا۔
چپ رہو کوئی سن لے گا۔ فرید! وہ عورت تھی بڑی خوبصورت
کیا تو جوان ہو گیا کہ عورتوں کو تکتا ہے؟
عبید نے کہا۔
تیرہ سال کا ہوں۔ نویں جماعت میں پڑھتا ہوں۔ کیا میں تجھے
جوان نظر نہیں آتا؟
فرید بولا۔
میں تجھ سے ایک سال بڑا ہوں مگر تیری طرح عورتوں کی طرف
نہیں دیکھتا۔
عبید نے کہا۔
بیوقوف ہے تو۔ انسان کا جی کسی چیز کو چاہے تو کیوں اپنا دل

مارے۔

فرید نے کہا۔

بیوقوف تو ہے۔ آدمی کو چاہیئے کہ قانون کی پابندی کرے۔ چاہے وہ ملک کا قانون ہو یا مذہب کا۔

عبید نے جلدی سے کہا۔

بھیا! ہم سے کوئی پابندی نہیں ہو سکتی۔ ارے! دیکھ وہ عورت رہی جس کے بٹوے پر میں نے ہاتھ صاف کیا تھا۔ مڑ کر نہ دیکھنا۔ وہ اس طرف آ رہی ہے۔

فرید سہم گیا۔

عبید نے اس سے چپکے سے کہا۔

ڈرتا کیوں ہے۔ تجھے تو اس نے دیکھا بھی نہیں۔

دو تین منٹ بعد ہی وہ دونوں عورتیں دکانوں کا چکر کاٹتی ہوئی اس طرف سے گزریں۔ وہ حسرت سے ایک ایک چیز کو دیکھ رہی تھیں مگر پیسے پاس نہ رہنے کی وجہ سے کچھ خریدنے سے قاصر تھیں۔

عبید نے آواز بلند کر کے کہا۔

میں نے کہا آداب۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں اپنے کھوئے ہوئے

پیسے مل گئے۔

ان کے پیچھے ایک دو چھیٹے لگ گئے تھے۔ چنانچہ ان سے نجات پانے کی غرض سے وہ عبید کی دُکان کی طرف مُڑ گئیں۔

کھوئی ہوئی چیز کب ملتی ہے۔ اچھا یہ ہے تمہاری دُکان۔

جس خاتون کے عبید نے پیسے چرائے تھے اس کی ساتھ والی عورت نے کہا۔

حسین خاتون نے کہا

اللہ نے چاہا تو میرے پیسے اسے ہضم ہی نہ ہوں گے اور جانے لگی۔

ساتھ والی عورت نے ایک دکان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

صفیہ! دیکھو اس دکان پر ویسا ہی جمپر ہے جیسا تم چاہتی تھیں

صفیہ نے کہا۔

اب تم بھی میرے لٹنے کا مذاق اڑانے لگیں۔ پیسے باقی رہتے تو اور بہت سی چیزیں خرید لیتی۔

مگر اب وہ اپنے نقصان پر زیادہ دلگیر نظر آ رہی تھی۔

عبید نے پہلی بار انسانوں کی طرح کہا۔

دیکھئے! تکلف برطرف۔ تیس پینتیس روپے تو میں آپ کو

دکان سے دے سکتا ہوں۔ کل یہیں آکر آپ واپس کر سکتی ہیں۔

فرید بھی ہمدردانہ بولا۔

ہاں اتنے تو میری جیب میں ہوں گے۔ آپ بے تکلف لے سکتی ہیں۔

حالانکہ اس کے پاس کچھ نہ تھا۔

نہیں شکریہ!

صفیہ نے مسکرا کر کہا۔

اندر جانے لگی۔

ساتھی عورت نے کہا۔

لے لو صفیہ! کیا حرج ہے؟ کل تم لاہور جا رہی ہو۔ یہاں نہ آسکو گی۔ اس لیئے اب دونوں لڑکیوں میں سے ایک کو بھی ساتھ لے جانا اور مکان پر لے جا کر روپیہ دے دینا۔

صفیہ خاموش ہو گئی۔ شاید اس تجویز سے اس کو اتفاق تھا۔

فرید نے اپنی جیب سے روپے نکال کر صفیہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

لیجئے یہ پینتیس روپے حاضر ہیں۔ جو کچھ آپ کو خریدنا ہے، بے تکلف خرید لیجئے۔

یہ روپے حقیقتاً صفیہ ہی کے تھے جنہیں عبید نے چرا کر فرید کے

حوالے کر دیئے تھے۔

بہرحال یہ پیش کش مخلصانہ تھی

صفیہ نے سر ہلا کر کہا۔

نہیں میاں شکریہ!

اور چل دی مگر ساتھ والی عورت نے مسکرا کر فرید سے روپے

لے لیئے اور صفیہ سے آملی۔

غرض صفیہ نے انہی روپوں سے اپنی مطلوبہ اشیا خریدیں۔

اور دس پندرہ منٹ بعد عبید کی دکان پر پھر آ گئی۔

صفیہ نے دونوں لڑکوں سے دریافت کیا۔

اچھا میرے ساتھ اپنے روپے لینے میرے مکان تک تم دونوں

میں سے کون چلے گا؟

فرید بولا۔

ایسی جلدی کیا ہے۔ کل آ کر دے جایئے۔

صفیہ نے مسکرا کر کہا۔

کل میں باہر جا رہی ہوں۔ اس لئے تمہارا قرضہ شکریہ کے ساتھ

آج ہی بے باق کر دینا چاہتی ہوں۔

فرید نے کہا۔
تم چلے جاؤ عبید۔ مجھے ابھی مکان پر پہنچنا ہے۔ کیونکہ امّاں کی طبیعت خراب ہے
عبید نے کہا۔
ہیں۔ ہاں ہاں لیکن یار ماموں کہہ گئے ہیں کہ جب تک وہ لوٹ کر نہ آئیں، میں دکان نہ چھوڑوں۔
لیکن دل چاہتا تھا کہ صفیہ کے ساتھ جائے۔
فرید نے کہا۔
میں چند منٹ کے لئے دکان پر بیٹھتا ہوں۔ تم ہی چلے جاؤ ان کے ساتھ۔
وہ عورتوں سے شرماتا ہے۔
عبید نے کہا۔
اچھا! لیکن ماموں کے آنے تک نہ اٹھنا یہاں سے۔ وہ آتے ہی ہوں گے۔
اندر جوتے پہن کر جانے کے تیار ہو گیا۔
عبید نے صفیہ سے دریافت کیا۔
کیا آپ کا مکان دور ہے یہاں سے؟

صفیہ مسکرا کر بولی۔
ہاں ہے تو دور۔ اطمینان رکھو تمہیں پیدل نہیں گھسیٹوں گی۔ باہر چل کر کوئی گاڑی کر لیں گے۔
چنانچہ باہر آکر گاڑی کر لی گئی۔
ساتھ والی عورت نے کہا۔
اچھا صفیہ! میں تو چلوں اب۔ اس لڑکے کے ساتھ جانے میں تجھے کوئی اندیشہ تو نہیں۔
اُسے کیا معلوم تھا کہ یہ لوٹ کا زہر کا بجھا ہوا ہے۔
صفیہ نے کہا۔
ہاں جاؤ تم۔ اب تو لاہور سے واپسی پر ہی ملاقات ہو گی۔
کب تک واپسی ہو گی تمہاری؟
صفیہ نے جواب دیا۔
پندرہ روز تو لگ ہی جائیں گے۔
ساتھ والی عورت نے کہا
اچھا خدا حافظ!
اور چلی گئی۔
ادھر گاڑی روانہ ہوئی۔

صفیہ کی معیت میں عبید ایک لطف سا محسوس کر رہا تھا۔ شباب کی طرف تیزی سے اس کے دوڑتے ہوئے چلے آنے والے خون میں مسرت کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔

صفیہ عمر میں اس سے تقریباً ڈھائی گنا زیادہ ہونے کے باوجود حسین تھی۔ تندرست اور صاف ستھری بھی۔

عبید نے راہ میں دریافت کیا

لاہور کیوں جا رہی ہیں آپ؟

صفیہ نے مختصراً کہا۔

کام ہے۔

صفیہ نے سوال کیا۔

کون سی جماعت میں پڑھ رہے ہو تم؟

عبید بولا۔

نویں میں۔ میرے والد کا نام ضرور سنا ہو گا آپ نے؟

نہیں سنا۔

صفیہ نے اس سے اس طرح تخاطب جاری رکھا جیسے بچوں کے ساتھ ہوتا ہے

عبید نے مشیخت کے طور پر کہا۔

خان بہادر کریم الدین کا لڑکا ہوں۔ انہیں کون نہیں جانتا۔
صفیہ اسی طرح مسکرا کر بولی۔
اچھا اب بھی خان بہادر؟
کیوں اب کیا ہو گیا؟
صفیہ نے کہا۔
خیر کچھ نہیں۔ تم نہیں سمجھتے۔
عبید نے پوچھا۔
اچھا آپ کے شوہر کیا کرتے ہیں؟
صفیہ نے مسکرا کر کہا۔
ایسے سوالات نہیں کیا کرتے۔
واہ! اس میں کیا حرج ہے۔ آپ نے جو مجھے میرے والد کا نام دریافت کیا تھا۔
صفیہ نے اس کے جھوٹ کو نظر انداز کر کے کہا۔
میں نے تو دریافت نہیں کیا تھا۔ تم نے از خود بتایا تھا۔
عبید نے کہا۔
اچھا اگر میں آپ کو اپنے متعلق سب کچھ بتا دوں تو کیا آپ بھی اپنے بارے میں مجھے کچھ بتائیں گی۔

صفیہ نے کہا۔
تم بہت باتونی معلوم ہوتے ہو۔ پڑھنے میں زیادہ دل لگایا کرو۔
عبید بولا۔
اوّل تو مجھے پڑھنے کی کوئی ایسی ضرورت نہیں، کیونکہ ہمارے پاس بہت پیسہ ہے۔ یہ سمجھئے کہ پرسوں ہی ابّا کے ایجنٹ نے ایک پانچ ہزار روپے کی مالیت کا لائسنس بیس ہزار میں فروخت کیا ہے۔
صفیہ چونک سی گئی۔
صفیہ نے پوچھا۔
کیا تم اپنی ان باتوں کا ذکر ہر ایک سے کر دیتے ہو۔
عبید نے کہا۔
نہیں تو۔ صرف ایسے لوگوں سے جنہیں ہم نہیں جانتے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ہمارے پاس روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں۔ میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ ہمارے ہاں تقریباً روزانہ ہی بہت سے روپے آتے رہتے ہیں۔
صفیہ سوچنے لگی۔

یہ خود کو کسی خان بہادر کا لڑکا بتاتا ہے۔ ممکن ہے اس کا والد اپنی خان بہادری کی آڑ میں زبردست مارکیٹ کرتا ہو یا اسمگلر ہو۔ مگر بچے کی باتوں پر کیا جاؤں۔ پھر اس نے دل میں کہا۔

غرض عبید تمام راستے ڈینگیں مارتا رہا۔ صفیہ کا دماغ چاٹ گیا، مگر اس نے اس کی باتوں پر کوئی توجہ نہیں کی۔ خاموشی سے راستہ کاٹتی رہی۔

آخر صفیہ کا چھوٹا سا خوشنما مکان آ گیا اور وہ اُتر پڑی۔

تم اس گاڑی میں واپس نمائش چلے جانا۔ میں اندر سے کرایہ لاتی ہوں۔

صفیہ نے کہا۔

اندر مکان میں چلی گئی۔

چند منٹ بعد واپس آئی تو اس کے ساتھ بارہ تیرہ سال کی ایک خوبصورت گڑیا سی لڑکی تھی۔

لڑکی نے عبید کو گاڑی میں بیٹھا دیکھ کر کہا۔

اوہو امی! یہ مزدور لڑکا اچھے کپڑے پہنے ہوئے ہے۔

صفیہ اپنی لڑکی کی باتوں پر ہنسنے لگی۔

لو میاں عبید! یہ تمہارے قرضے کے روپے، یہ تمہاری واپسی کا کرایہ اور یہ انعام اس کی مٹھائی کھانا۔

حنفیہ نے اسے سب روپے دیتے ہوئے کہا۔

عبید حنفیہ کی خوبصورت لڑکی کو دیکھتا ہوا روانہ ہوا۔

عبید بہت اچھا رہا کہ اس نے صفیہ کے روپے بھی چرائے ۔ نہی اسے قرض دیئے ۔ پھر وہی وصول بھی کر لئے ۔ اس کے ساتھ گاڑی میں سیر بھی کر لی ۔ اس کا مکان بھی دیکھ لیا ۔ انعام بھی پا لیا اور اس کی بے محابہ اُبھرتی ہوئی جوانی کی تسکین یا اشتعال کے لئے یہ بھی ہوا کہ اس نے صفیہ کی خوبصورت لڑکی کی زیارت بھی کر لی۔

ایک نابالغ یا نیم بالغ بے کردار لڑکے کے لئے یہ بہت کچھ تھا ۔ کیا صفیہ نے اسے اپنا مکان بتا کر غلطی کی تھی ؟ مگر اسے کیا معلوم تھا کہ یہ لڑکا دوسری قسم کے لچھن رکھتا ہے۔

دوسرے روز عبید نے بڑے فخر سے اپنا کل والا کارنامہ اپنے والدین کو سنایا۔

باپ نے ہنس کر کہا۔

یہ مجھ سے بھی تیز نکلے گا۔

ماں بھی فخریہ بولی۔

دیکھنا پڑھ لکھ کر یہ تمہارے بھی کان کترے گا۔

والد نے کہا۔

میں تو بغیر تعلیم کے خان بہادر بھی بن گیا اور پیسے والا بھی، دیکھو یہ وکیل بن کر کما تا ہے۔

عبید بولا۔

ہاں ابا میں تو ایل ایل بی کروں گا۔ عدالت میں جج کو بھی ایسے جھانسے دوں گا کہ وہ بھی یاد کرے گا۔

ماں نے صفیہ کے متعلق دریافت کیا۔

کیسی عورت تھی عبید وہ؟

عبید نے جواب دیا۔

بہت خوبصورت، ممانی سے بھی زیادہ حسین اور اس کی لڑکی، اس سے بھی زیادہ اچھی۔

والدہ نے کہا۔
اب نہ جانا اس کے مکان پر، مبادہ وہ تم پر شک کرنے لگے۔
عبید نے کہا۔
واہ! میں تو جاؤں گا۔ ذرا لاہور سے آجائے وہ۔
اتنے میں گھنٹی بجی۔
والد نے کہا۔
دیکھنا عبید کون آیا ہے؟
عبید نے کہا۔
نوکر کہاں مر گئے کہ میں دیکھنے جاؤں۔
پھر گھنٹی بجی۔ آخر عبید کا والد ہی باہر آیا۔
عبید کے والد نے ملاقاتیوں کو دیکھ کر کہا۔
ہلو۔ ہلو! میں تو کئی روز سے تم لوگوں کا انتظار کر رہا تھا۔ کہاں غائب تھے۔
چار پانچ آدمی تھے۔
ان میں سے ایک بھینگا تھا۔ ایک کے ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ ایک گنجا تھا۔ دو کے حلیے ذرا ٹھیک ٹھاک تھے مگر شکل سے

وہ بھی کچھ بے تکے سے نظر آرہے تھے۔
گنجے نے عبید کے والد سے کہا۔
اب کے کریم الدین سیٹھ تم نے اوپر والوں کو شاید کم پیسے کھلائے
ہیں۔
خان بہادر نے پوچھا۔
مجھے صرف خان بہادر کہا کرو۔ اچھا کیا ہوا؟
پٹی والا شخص بولا۔
مال پکڑا گیا اور گولی سے زخمی ہوا۔
خان بہادر نے کہا۔
کوئی بات نہیں۔ باہر سے تھوڑی سی نئی پولیس آگئی ہے چند
روز کی بات ہے۔ پھر ہم میں گھل مل جائے گی۔
ایک شخص بولا۔
مگر سکندر خاں نے تو اپنا حصہ دھرا لیا۔
دوسرے شخص نے کہا۔
وہ تو دینا ہی پڑتا ہے۔ چاہے دائیں لگے یا خالی جائے۔
خان بہادر نے دریافت کیا۔
اچھا اگلا مال کہاں ہے؟

گنجہ بولا۔
وہ رکھتا ہے۔
پہلا شخص بولا۔
کیا دیتا ہے حاجی موسیٰ اس کے؟
ہٹی والے شخص نے جواب دیا۔
تین لاکھ۔
خان بہادر نے کہا۔
دماغ خراب ہوا ہے اُس کا۔ پانچ سے کم میں نہ دینا۔ کھلے بھاؤ میں سات لاکھ کا ہو گا۔
دوسرے شخص نے کہا۔
پھر تو دس لاکھ میں دینا چاہیئے۔
خان بہادر نے پوچھا۔
ہاں پر تو بتاؤ کہ اس عورت کا کیا ہوا؟
گنجے نے کہا۔
آجائے گی۔ دو سپاہیوں اور ایک سب انسپکٹر کو پیسے دے دیئے ہیں۔
پہلا شخص ہنس کر بولا۔

یار کریم الدین! تجھے روپیہ اور عورت دونوں کی حرص ہے۔
خان بہادر نے کہا۔
اس کی حرص کس کو نہیں۔ اوپر کی ریاست میں بھی یہی ہو رہا ہے
گنجے نے کہا۔
تمہارا لونڈا بڑا شریر ہو گیا ہے۔ کریم الدین! ابھی سے لڑکیوں کا پیچھا کرتا ہے۔
خان بہادر کریم الدین نے مسکرا کر کہا۔
اب یہ اس کی عمر کھیلنے کودنے ہی کی ہے۔ ہم بھی بچپن میں ایسے ہی تھے۔
دوسرے شخص نے کہا۔
مگر تم پڑھنے لکھنے سے رہ گئے۔ اسے اس معاملہ میں اپنا جیسا نہ رہنے دینا۔
خان بہادر نے کہا۔
نہیں۔ عبید تو خود کہتا ہے کہ ایل ایل بی کرے گا۔
دوسرے شخص نے کہا۔
اچھا ہے، آئندہ جن مقدمات میں تم ماخوذ ہوگے، ان کی وہ پیروی کر لیا کرے گا۔

خان بہادر نے گنجے سے کہا۔

میاں رزاق! تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میرے لئے مستقل کسی عورت کا انتظام کرو گے۔

پٹی والا شخص بولا۔

آ تو رہی ہے دو چار روز میں ایک عورت۔

خان بہادر نے کہا۔

ہاں مگر وہ تو چند روز کے بعد چلی جائے گی۔

پہلے شخص نے پوچھا۔

پھر کیا ایک شادی اور کرنا چاہتے ہو؟

خان بہادر کریم الدین نے کہا۔

شادی کے جھگڑے میں کون پڑے۔ میں تو وظیفہ کا معاملہ رکھنا چاہتا ہوں۔ بشرطیکہ عورت خوبصورت ہو۔

گنجہ بولا۔

مگر اسے تم کو دم بھی دینا پڑے گا کہ جلد اس سے شادی کر لو گے۔

کریم الدین نے دریافت کیا۔

کوئی ہے تمہاری نگاہ میں؟

گنجے نے جواب دیا۔
ہے تو سہی مگر وہ شادی شدہ ہے۔
ہیٹ والا شخص بولا۔
اوہو! اس کا سہاگ اُجاڑتے کتنی دیر لگتی ہے۔
کریم نے کہا۔
اگر تم اس آدمی کو ٹھکانے لگا دو گے تو تمہیں بہت انعام دوں گا
دوسرے شخص نے کہا۔
مگر پہلے اس عورت کو تو دیکھ لو۔ اگر پسند نہ آئی؟
گنجے نے کہا
ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ کل ہی چل کر دیکھ لینا۔ اگر پسند
نہ آئے تو میرے جیب یا صاف کر دینا۔
ہیٹ والے نے ہنس کر کہا۔
ابے! اتنی تو صاف ہے تیری چندیا۔
کریم نے دریافت کیا۔
اچھا تو رزاق کب دکھاؤ گے اسے؟
گنجے نے جواب دیا۔
کسی روز بھی دیکھ لینا۔ وہ تو کل ہی نمائش میں آئی تھی۔

کریم نے کہا۔
اچھا پرسوں چلیں گے۔
دوسرے شخص نے کہا۔
اچھا میاں! تم عورت کے چکر میں پھنس گئے۔ میں نے کہا۔
سکندر خان کے حصے کو نہ بھولنا۔
گنجے نے کہا۔
سکندر خان ہی نہیں بلکہ نواب صاحب، جاگیردار صاحب، پیر صاحب، امیر صاحب، شہواری صاحب، کبیر صاحب وغیرہ وغیرہ سب ہی کو حصہ پہنچے گا۔
پگڑی والے نے جام چڑھا کر کہا۔
سارا ملک ان کی جاگیر ہے بابا۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔

ہر چند خود صفیہ ہی کی زبانی عبید کے علم میں آ چکا تھا کہ وہ دوسرے روز لاہور جا رہی ہے مگر عبید نے سوچا کہ ممکن ہے کسی وجہ سے اس کی روانگی ملتوی ہو گئی ہو اور وہ نہ جا سکی ہو۔ جا کر اس کے پر دیکھنا تو چاہیئے۔

صفیہ کے روپے چرانے کے بعد عبید اگر ذرا حساس لڑکا ہوتا تو صفیہ سے آنکھ ملاتے اسے شرم آنی چاہیئے تھی مگر وہ ایک ہی ڈھیٹ واقع ہوا تھا۔

اوّل تو اس کی آمدنی خرچ سے بہت کافی بڑی مدت سے

چمٹ جانا چاہتی تھی مگر صفیہ کی خوبصورت بچی کو دیکھ لینے کے بعد اب وہ اس گڑیا سے کھیلنا چاہتا تھا۔

مگر صفیہ کے مکان پر جانے کا اسے کوئی بہانہ نظر نہیں آتا تھا۔

آخر دوسرے روز عبید نے فرید سے دریافت کیا۔

کہو میاں فرید! اس عورت کے مکان پر چلتے ہو؟

فرید نے کہا۔

تم بھی عجیب آدمی ہو۔ ایک تو تم نے اس کے بٹوے پر ہاتھ صاف کیا تھا۔ پھر بھی اسے منہ دکھانے کی جرأت کرتے ہو۔

عبید نے کہا۔

مگر احمق اسے اب یہ شک نہیں رہا کہ اس کے روپے ہم نے لئے تھے۔

فرید نے کہا۔

لیکن تمہارا خود کا تو ضمیر مجرم ہے۔ تمہیں اپنے طور پر تو احساس ہو گا کہ تم نے اس کا جرم کیا ہے۔

عبید نے کہا۔

ابے کیسا جرم ہم آدمی جو کام کر گزرتے وہ اس کا کارنامہ ہے۔

فرید نے کہا۔

چاہے وہ کسی کو قتل کر ڈالے۔

عبید نے اپنے نظریے کے مطابق کہا۔

یہ تو رات دن یہاں ہو رہا ہے۔ اپنی غرض پوری کرنے کے لئے انسان کیا کچھ نہیں کرتا۔

فرید نے کہا۔

عبید! اگر تم کہیں کھلے ہوئے میدان دیکھو تو کیا یہ سمجھو گے کہ پوری زمین ایسی ہی ہموار ہے اور اس پر پہاڑ، دریا، جنگل اور گڑھے نہیں ہیں؟

عبید نے کہا۔

تو ہمیشہ الٹا چلتا ہے۔ میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ صفیہ کی لونڈیا اپنی ماں سے بھی اچھی ہے۔

فرید بولا۔

پھر مجھے اس سے کیا۔

عبید نے کہا۔

تمہیں نہیں تو مجھے تو ہے۔

فرید نے مسکرا کر کہا۔

عبید تُو ہے تو تیرہ چودہ سال کا مگر تیرے آگے تو عمر رسیدہ غنڈے بھی ہیچ ہیں۔

عبید نے کہا۔

اس میں غنڈے پن کی کیا بات ہے احمق۔ ہر شخص اپنے فعل میں آزاد ہے۔

فرید بولا۔

تیری انہی باتوں سے مجھے شدید اختلاف ہے۔ میں تجھے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ شہری پابندی ہی سے انسان، انسان کہلانے کا مستحق ہے ورنہ وہ جانور ہے۔

عبید نے کہا۔

چل جانور رہی سہی۔ امریکہ بھی جانور ہے۔ روس بھی جانور ہے۔

فرید نے پوچھا۔

اچھا جانور صاحب! آج نمائش میں چلو گے یا نہیں؟

عبید نے جواب دیا۔

اب تو صفیہ جب لاہور سے لوٹ آئے گی تب ہی چلیں گے۔

تم تو اس کے مکان پر جانے کا ارادہ کر رہے تھے نہ؟

عبید نے مسکرا کر کہا۔

اچھا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی لڑکی کے ذکر سے تمہارے منہ میں بھی پانی بھر آیا ہے۔

فرید نے کہا۔

نہیں بھئی! میں ان چیزوں سے دور ہوں۔

عبید نے کہا۔

صفیہ کی لڑکی جلدی سے جوان ہو جائے، میں اس سے شادی کروں گا۔ مگر یار فرید! اس کی اٹھان اچھی ہے۔ وہ اب بھی نیم جوان نظر آتی ہے۔

اور تم نیم جان۔ ممکن ہے وہ بھی تمہاری طرح وقت سے پہلے بالغ ہو گئی ہو۔

عبید کچھ سوچتا ہوا بولا۔

فرید ایک بات ذہن میں آئی۔

فرید نے کہا۔

خدا کرے کوئی اچھی بات ہو۔

عبید نے کہا۔

ہر بات اچھی ہی ہوتی ہے۔ بری تو وہ زبانوں پر آ کر بنتی ہے۔

فرید نے کہا۔

تمہارا یہ نظریہ بھی غلط ہے۔ بُری نیّت اور بُرے فعل کا نتیجہ ہی بُرائی ہے۔

بیکار باتوں میں مجھ سے اُلجھو نہیں، میں یہ کہہ رہا تھا کہ —

لیکن عبید رُک گیا۔

فرید نے کہا۔

بولو بولو۔

عبید نے کہا۔

پہلے وعدہ کرو کہ کسی سے کہو گے نہیں۔

فرید نے کہا۔

کچھ منہ سے تو کہو۔

آخر عبید نے اپنی نیّت ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

میرے جی میں یہ آئی ہے کہ صفیہ کی لڑکی کو اڑا دیا جائے وہ عین میرے لائق ہے۔

فرید نے بدحواس ہو کر کہا۔

کیا کہا! عبید کیا تم ایسی خطرناک و عزّت سوز بات بھی سوچ سکتے ہو۔

عبید بولا۔
چنچو نہیں۔ یہ بتاؤ کہ تم اس معاملہ میں میری کہاں تک مدد کر سکتے ہو۔
فرید نے کہا۔
اس کے برعکس میں تم سے یہ کہوں گا کہ اگر تم مجھے اپنا دوست سمجھتے ہو تو ایسی نامبارک باتوں کو میرے کہنے سے قطعی اپنے دل سے نکال ڈالو۔ ایک غلط قدم سے انسان کی پوری زندگی تباہ ہو سکتی ہے۔
عبید نے کہا۔
مجھے تم سے یہی اُمید تھی کہ ایسا ہی جواب دو گے۔
فرید نے کہا۔
میں حیران ہوں عبید کہ اس قدر ناپاک خیال کو تم نے اپنے دل میں کس طرح وارد ہونے دیا۔ مان لیا کہ صفیہ خوبصورت ہے مگر اس کے یہ تو معنی نہیں کہ اسے حاصل کرنے کے لئے تم سفیہانہ و غیر قانونی حرکت کرو۔ تمہارے والدین دولت مند ہیں اور بظاہر انھوں نے نام بھی پایا ہے۔ اس لئے تم باعزت طریقے سے اگر اپنا پیغام صفیہ کی لڑکی کے لئے دو تو ممکن ہے کامیاب

ہو جاؤ۔ حالانکہ شادی کرنے کی ابھی نہ تو تمہاری عمر ہے نہ صفیہ کی لڑکی کی اور نہ میری۔

عبید خاموش ہو گیا۔

آج کل کوئی کسی کی پند و نصیحت سننے کو تیار نہیں۔ اولاد والدین کی نصیحت کا مذاق اڑاتی ہے اور عوام حکومت کی ہدایات کو ٹھکراتے ہیں۔

یہ سائنس کا آدمی نہیں ہے بلکہ سائنس کے فضلہ کا انسان ہے۔

کتنی عجیب بات تھی کہ گنجے کی معرفت عبید کا باپ صفیہ کو دگنجے نے جس عورت کو خان بہادر کریم الدین کے لئے فراہم کرنے کی تجویز کی تھی وہ صفیہ ہی تھی اور اس کے شوہر کو ٹھکانے لگانے کا مشورہ پٹی والے شخص نے دیا تھا) اڑانا چاہتا تھا اور صفیہ کی لڑکی پر بیٹا ہاتھ صاف کرنا چاہتا تھا۔

حالانکہ باپ بزعم خود خان بہادر معزز انسان تھا خواہ باطن میں کچھ ہی ہو اور بیٹا نابالغ یا نیم بالغ۔

آخر عبید نے اس سے مایوس ہو کر کہا۔

اچھا فرید! مجھے اپنے حال پر چھوڑ دو۔ مجھے تمہاری نصیحت کی ضرورت نہیں۔

فرید نے کہا۔
ایک شہری کی حیثیت سے میرا فرض ہے کہ جرم گناہ کو روکوں۔
عبید نے کبیدگی سے کہا۔
تو ایک شہری کی حیثیت سے میں بھی آزاد ہوں کہ جو چاہوں کروں۔
فرید بولا۔
لیکن قانون کے دائرے میں رہ کر۔
عبید جھلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

فرید سے عبید بدمزہ ہو گیا۔

لیکن فرید کی عادت کسی سے بگاڑ کرنے کی نہ تھی۔ سب سے خوشگوار تعلقات رکھنا چاہتا تھا۔ یہ دوسری یہ بات تھی کہ عام لوگوں سے اس کی نبھتی کم تھی۔

اس روز کی گفتگو کے بعد سے عبید نے اس سے مُلنا جُلنا ترک کر دیا تھا۔ فرید نے اسے سمجھانا چاہا مگر عبید کا دل اس کی طرف سے کلیتہً صاف نہیں ہوا تھا۔ اس چیز کو فرید بھی محسوس کر رہا تھا۔

عبید کو اپنے گھر اور خاندان کے تمام حالات کا علم تھا۔ اسی طرح اپنے والد کا کردار اور اس کی سماج حرکات اس کے علم میں تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا خود کا کردار بھی کم عمری ہی میں اس قدر ننگا نظر آنے لگا تھا۔

راعی کے کردار و حرکات کا اثر رعایا پر پڑتا ہے۔ اسی طرح والدین کے طور طریقے اولاد سیکھتی ہے۔ چنانچہ قدرتاً عبید بھی اپنے گھرانے کے ماحول میں ڈھل رہا تھا اور عمر کے ساتھ ساتھ اس میں بھی وہی پختگی پیدا ہوتی جا رہی تھی جو اس کے گھر والوں میں تھی۔

فرید ایک متوسط خاندان کا لڑکا تھا۔ پڑھنے میں تیز اور فطرتاً نیک۔ عبید باوجود اپنی خورد سالی کے فرید کی اچھائیوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔

چونکہ دونوں ایک ہی سکول میں پڑھتے تھے۔ اس وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ رہتے تھے اور ان کے درمیان ایسے تعلقات تھے جو کبھی کشیدہ ہو جاتے تھے، کبھی قائم ہو جاتے تھے۔

کچھ دن بعد جب دونوں کے تعلقات ذرا ہموار ہو گئے تو عبید نے کہا۔

میری سمجھ میں ایک ترکیب آئی ہے فرید۔

فرید نے پوچھا۔

کیا تمہاری سمجھ ادھر کیا ترکیب؟

عبید نے کہا۔

تم اپنے راستے پر چلنے کی مجھے جس قدر ترغیب دو گے۔ اسی قدر میں اس سے منحرف ہوں گا۔

فرید نے کہا۔

نہیں بھائی میں ترغیب دینے والا کون۔ خدا نے تمہیں بھی آنکھیں دی ہیں۔ اپنے راستوں کے گڑھوں کو تم بھی دیکھ سکتے ہیں۔

عبید نے کہا۔

اچھا آؤ۔ آج ذرا نمائش تک چلیں۔ کافی دن ہو گئے۔

فرید بولا۔

کیا تمہارا خیال ہے کہ صفیہ لوٹ آئی ہو گی؟

عبید نے مسکرا کر کہا۔

آہا! تمہیں بھی صفیہ یاد ہے، حالانکہ میں اسے بھول چکا ہوں۔ البتہ اس کی لڑکی یاد ہے۔

فرید نے کہا۔

مجھے صفیہ تو یاد نہیں مگر اس کے پیسوں پر جس طرح تم نے ہاتھ مارا، وہ نہیں بھولا ہوں۔

عبید نے کہا۔

تمہیں شاید یہ بھی یاد ہوگا کہ اُس کے پیسے میں نے تمہارے لئے ہی میں نے اڑ لئے تھے۔

فرید نے کہا۔

اور تم یہ بھی نہیں بھولو گے کہ تمہارے ذریعہ وہ پیسے میں نے صفیہ کو واپس دے دیئے تھے جنہیں تم اس کے مکان پر پہنچ کر واپس لے آئے۔

عبید نے کہا۔

کیا ہم بیکار بحث میں نہیں اُلجھ رہے ہیں؟

فرید بولا۔

ختم کرو۔

اس کے بعد دونوں نمائش میں روانہ ہوئے۔

آج نمائش میں غیر معمولی اژدہام تھا۔ دونوں سیر سپاٹے کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد فرید نے عبید سے فرمائش کی کہ اب ذرا چل کر اس کے (عبید کے) ماموں کی دکان پر دم لیں۔

عبید نے کہا۔

ابھی نہیں۔ آؤ ذرا اس طرف والی دکانوں کا چکر لگائیں۔

دونوں دکانوں کی طرف چلے گئے۔

دکانیں سب ہی بلیک مارکیٹ کی وجہ سے بارونق تھیں مگر جن دکانوں پر زیادہ بھیڑ تھی، وہی چور بازاری کا مرکز تھیں۔ حد تو یہ ہے کہ چور بازاری کرنے والے مقررہ قیمت پر دو پیسے تک زیادہ لینے سے نہیں چوکتے۔

دراصل چور بازاری کی انسداد کا قانون ہی غلط ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ سزا صرف نفع خوروں ہی کو نہ دی جائے بلکہ چور بازاری کے خریداروں کو بھی اتنی سنگین سزا ملے کہ کبھی خرید و فروخت کے لئے ان کے پاس کہاں سے پیسے آئیں۔

ایک جگہ ٹھٹک کر عبید نے کہا۔

دیکھنا فرید اس آدمی کے ساتھ جو عورت جا رہی ہے کہ وہ صفیہ ہی تو نہیں؟

میں کیوں جا کر دیکھوں۔ تم جاؤ۔

عبید نے کہا۔

ٹھہرو! وہ لوگ مڑ کر اسی طرف آ رہے ہیں۔ آہا صفیہ ہی

ہے۔ دیکھو اس کے ساتھ اس کی لڑکی بھی ہے جس کا میں نے تم سے ذکر کیا تھا۔

فرید نے کہا۔

آج کوئی بیہودگی نہ کر گزرنا۔ صفیہ کے ساتھ آج اس کا شوہر بھی ہے۔

عبید نے کہا۔

یہ کیا ضروری ہے کہ وہ آدمی اس کا شوہر ہی ہو۔ آشنا بھی ہو سکتا ہے۔

فرید بولا۔

میں ہمیشہ انسان کے لئے اچھی ہی رائے قائم کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ صفیہ اس قماش کی عورت معلوم نہیں ہوتی۔

اس اثنا میں وہ لوگ ادھر سے گزرے۔

عبید آگے بڑھ کر صفیہ سے مخاطب ہوا۔

آداب عرض! کیسے لاہور ہو آئیں آپ؟

صفیہ اپنے شوہر سے باتیں کرتی ہوئی جا رہی تھی۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔

عبید کو پہچاننے میں اسے دقت پیش نہیں آئی۔ عبید کے پیچھے

فرید کچھ بے تعلق بنا کھڑا تھا۔
صفیہ دونوں کو دیکھ کر مسکراتی ہوئی بولی۔
اوہو! عبید میاں! اچھا فرید بھی موجود ہیں۔
صفیہ کی خوبصورت لڑکی نے عبید کو دیکھ کر کہا۔
امّی! یہ شاید وہی لڑکا ہے جو اس سندگارڈی میں آپ کے ساتھ آیا تھا۔
اس کی خوبصورت ماں ہنسنے لگی۔
فرید نے صفیہ کی لڑکی کو اب تک نہیں دیکھا تھا۔
اب اس پر نظر پڑی تو اسے ایک غنچۂ نودمیدہ نظر آیا۔
بارہ سال کا سِن۔
چہرے پر کچھ معصومیت، کچھ تمکنت۔
فرید کو وہ بہت ہی اچھی معلوم ہوئی۔
صفیہ کے شوہر نے ان دونوں کے متعلق دریافت کیا۔
کون لڑکے ہیں یہ؟
صفیہ نے ان کا اپنے شوہر سے تعارف کرایا۔
صفیہ نے عبید سے کہا۔
ہم تو تمہاری دُکان ہی بھول گئے۔ کدھر ہے وہ؟

عبید نے کہا۔
آپ اسے پیچھے چھوڑ آئیں۔ چلئے۔
صفیہ نے اپنی لڑکی کے متعلق کہا۔
پھر آئیں گے۔ شمی کو گھر پہنچنے کی جلدی ہے۔ کیونکہ اسے پڑھنا ہے۔
بی شمی کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا جس میں خریدی ہوئی کچھ چیزیں تھیں۔ تھیلے کو شمی کھڑی ہوئی ہلا رہی تھی کہ اس کا منہ کھل گیا۔ اور اس میں سے کئی چیزیں نکل کر زمین پر آرہیں۔
اس پر عبید تو خوب ہنسا مگر فرید نے اٹھا کر انہیں جمع کیا اور جھاڑ پونچھ کر واپس تھیلے میں رکھ دیا۔
شمی نے فرید کا شکریہ ادا کیا۔
تھینک یو۔
عبید نے غنڈوں کی طرح اسے دیکھ کر دانت نکوستے ہوئے کہا، اور ہمارا شکریہ نہیں۔
شمی بولی۔
ایڈیئٹ (احمق)
عبید تو بے حیائی سے ہنسنے لگا مگر شمی کے والد نے اپنی لڑکی

کو ڈانٹا۔

عبید نے ہنستے ہوئے کہا۔

میں بھی خان بہادر کا لڑکا ہوں۔

منشی نے تیوری چڑھا لی۔

صفیہ نے کہا۔

اچھا عبید میاں! پھر کسی روز آئیں گے

اور روانہ ہوئی۔

عبید کھڑا ہوا کشتی کو دیکھتا رہا۔ اسے دیکھتا فرید بھی رہا۔

مگر اس کی آنکھوں میں شرافت تھی۔

یہ تھی صفیہ کی لڑکی؟

خوب ہے۔ اللہ اسے نظرِ بد سے بچائے۔ فرید دل میں سوچ رہا تھا۔

مگر اس کے بعد عبید اپنی بے تابانہ عادات کی بنا پر صرف ایک ہی طریقے سے شمی کو دیکھتا رہا۔

حالانکہ اس شب کو نمائش میں شمی اپنے والد کے ساتھ آئی تھی مگر عبید اپنی بے باکیوں سے باز نہ آیا تھا۔

عبید اب شمی کے بارے میں فرید سے کوئی تذکرہ نہیں کیا

کرتا تھا کیونکہ فرید اس کا ہمنوا نہ نکلا بلکہ الٹا اسے لیکچر دینا شروع کر دیا تھا۔

اسی بنا پر ان دونوں لڑکوں کے درمیان کچھ بُعد بھی پیدا ہو گیا تھا۔ ویسے آپس میں ملتے رہتے تھے مگر ظاہر داری کے ساتھ۔

عبید کی طبیعت میں تو کم عمری کے باوجود ابھی سے منافقت و فریب تھا۔ البتہ فرید اس معاملہ میں اس کے برعکس تھا۔

کئی روز بعد صفیہ پھر نمائش میں آئی۔ آج اس کے ساتھ اس کا شوہر نہ تھا بلکہ محلہ کی دو عورتیں تھیں اور رشتی بھی ہمراہ تھی۔

صفیہ کو عبید کی دکان سے کوئی سروکار نہ تھا اور نہ وہ عبید سے کوئی واسطہ رکھنا چاہتی تھی۔ اس سے غرض رکھنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

مگر عبید اسی تاک میں رہتا تھا کہ کب صفیہ نمائش میں آئے، اور کب وہ خواہ مخواہ اس سے ملنے کی کوشش کرے۔

ظاہر ہے کہ صفیہ کے حسن تک تو اس کم عمر لڑکے کی رسائی نہیں ہو سکتی تھی۔ البتہ وہ اس کی حسین لڑکی پر قابض ہونے کے منصوبے گانٹھتا رہتا تھا۔ اسی لیے صفیہ سے مراسم بڑھانے کا خواہاں تھا۔

عبید نے صفیہ کے پیچھے آ کر بے تکلفانہ کہا۔
میں نے کہا آداب۔
عبید نے کہا۔
آج آپ کے ساتھ آپ کے شوہر نہیں ہیں؟
وہ بات تو صفیہ سے کر رہا تھا مگر اس کی آنکھیں ششّی کی طرف لگی ہوئی تھیں۔
اس احمقانہ سوال کا صفیہ کیا جواب دیتی مسکرا کر رہ گئی۔
صفیہ نے کہا۔
تمہارے ساتھ آج فرید میاں نہیں ہیں۔
عبید نے کہا۔
وہ کھڑا تو ہوا ہے، وہ دور وہاں۔
فرید نے مناسب نہ سمجھا تھا کہ خواہ مخواہ عبید کی طرح صفیہ پر آ کر مسلط ہو جائے۔ البتہ دور سے وہ ششّی کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ اور اپنی چودہ سالہ زندگی میں تازگی و فرحت سی محسوس کرنے لگتا تھا۔
ششّی بولی۔
وہ وہاں چوروں کی طرح کیوں کھڑا ہے۔
وہ تھی تو بارہ ساڑھے بارہ سال کی مگر اس کی زبان خوب چلتی تھی۔

بڑی ذہین مگر ساتھ ہی صاحب پندار بھی واقع ہوئی تھی۔

عبید نے مسکرا کر شمی سے کہا۔

چیر رہی گا کہ آپ کے ڈر کی وجہ سے پاس نہیں آ رہا ہے۔

اس سے بات کرنے اور اپنے دوست کی برائی کرنے میں اسے لطف آیا۔

عبید نے صفیہ سے کہا۔

اچھا ہماری دکان پر چلئے نہ۔ آج میں ضرور لے جاؤں گا آپ کو۔

آج بھی صفیہ نے ٹالتے ہوئے کہا۔

پھر کبھی آئیں گے عبید میاں۔ میرے ساتھ والی ان عورتوں کو بہت کچھ خریدنا ہے۔

وہ کیا ایک لڑکے کے ساتھ اس کی دکان پر جاتی اچھی معلوم ہوتی۔

عبید نے شمی سے کہا۔

اچھا آپ چلئے شمی۔ میں آپ کو بہت سی اچھی اچھی چیزیں دکھاؤں گا۔

شمی نے اپنی خوبصورت پیشانی پر بل ڈال کر کہا۔

واہ! میں کیوں تمہارے ساتھ جانے لگی۔

عبید پھر شمی سے بولا۔

آپ ہمیں اپنے مکان پر بلاتی نہیں اور خود ہماری دکان پر نہیں چلتیں۔

شمی نے غرور سے جواب دیا۔

نہیں جاتے ہم کہیں، ہماری مرضی۔

آخر صفیہ پیچھا چھڑانے کو بولی۔

اچھا عبید میاں خدا حافظ! تم ہی آنا کسی روز ہمارے مکان پر۔

عبید نے کہا۔

بہتر ہے پرسوں آؤں گا۔ میں آپ کو، آپ کے مکان کو اور شمی صاحبہ کو بھول نہیں سکتا۔

صفیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چلی گئی۔

اور عبید وہاں سے ہٹ کر فرید سے آملا۔

عبید نے فرید سے کہا۔

فرید! میں عہد کر چکا تھا کہ آئندہ تم سے شمی کے متعلق کوئی گفتگو نہیں کروں گا مگر اس لونڈیا نے مجھے پاگل بنا دیا ہے۔

اس نے کچھ جواب نہیں دیا۔

عبید نے کہا۔

اس چھوکری کو غرّہ کس قدر ہے۔ نامعلوم کس بات پر اتراتی ہے۔

آخر فرید بولا۔

نہیں تمہیں اس سے کیا۔ پھر اس میں اترانے کا کیا سوال ہے وہ کبھی تم سے یا کسی اور سے بات کرتی۔

عبید نے کہا۔

میں بھی اسے مزہ چکھاؤں گا کہ سب فخر و غرور بھول جائے گی۔

فرید نے کہا۔

آخر تم اتنی اچھی لڑکی سے جلنے کیوں لگے ہو؟

عبید نے کہا۔

میں اس سے جلتا نہیں بلکہ اس پر مرتا ہوں مگر وہ کمبخت ہے کہ مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کرتی۔

فرید نے کہا۔

یہی اس کے اچھے ہونے کی دلیل ہے کہ ہر کس و ناکس کو منہ نہیں لگاتی۔

عبید نے غصہ سے کہا۔

میں ہر کس و ناکس میں سے نہیں ہوں۔ اسے جلد معلوم ہو جائے

گا کہ میں کون ہوں۔
شمی کے متعلق فرید بُرے کلمات سننے سے تکلیف محسوس کرنے لگتا تھا مگر مصلحتاً خاموش رہا۔
عبید بکنے گیا۔
اس مغرور لونڈیا کو معلوم نہیں ہے کہ میرے ساتھ لڑکوں کی ایک بڑی پارٹی ہے۔
آخر فرید نے سختی سے کہا۔
عبید! یہ تم ہر کیا پر کیا غصہ اتار رہے ہو اور تم نے ایک شمی ہی کو بلاوجہ اپنے غیظ کا نشانہ کیوں بنا لیا ہے۔
عبید نے کہا۔
کیونکہ شروع ہی سے میرے ساتھ اس کا طرزِ عمل منافرت لئے ہوئے ہے اور اس کے علاوہ اسے ابھی سے اپنے حسن پر اتنا ناز ہے۔
فرید بولا۔
مگر اس سے تم پر کیا زد پڑتی ہے؟
عبید نے کہا۔
کوئی زد ہی نہیں پڑتی؟ میں اتنے بڑے آدمی کا بیٹا، اس قدر

دولت مند، صاحب اثر پھر بھی وہ مجھے کچھ نہیں گردانتی۔

فرید نے کہا۔

تمہارے دماغ میں فتور پیدا ہو گیا ہے۔ اگر کوئی شخص دولتمند و صاحب اثر والدین کا بیٹا ہو تو کیا اسے یہ حق پہنچنے لگتا ہے کہ دوسرے بندگانِ خدا کو ایذا دے۔

عبید نے کہا۔

میں اس چھوکری پر ہاتھ صاف کر کے رہوں گا۔

فرید نے کہا۔

ایسے بُرے خیالات کو دل سے نکال دو۔ اوّل تو اس کی یا تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ پڑھنے میں دل لگاؤ اور نیک کام کرو۔

عبید نے بگڑ کر کہا۔

جا بے! بڑا آیا مجھے ہدائت کرنے والا۔

فرید خاموش ہو گیا۔

بگڑے اور بد کردار افراد پر پند و نصیحت کا مطلق اثر نہیں ہوتا۔ جو اصلاحی جماعتیں یا حکومتیں انسان کی نفسیات سمجھنے میں دھوکا کھاتی ہیں جو محض لیکچر یا اخلاق آموز بیانات اخبارات میں دینے پر اکتفا کرتی ہیں۔ وہ غلطی پر ہیں۔ اچھائی کو بُرائی پر غالب کرنے یا بُرائی کو اچھائی پر

مسلط کرنے کے لئے ہمیشہ قوت و طاقت استعمال کی جاتی ہے۔ آج
بھی انگریزی کا یہ مقولہ کہ
"ڈنڈے کو بچاؤ اور بچے کو بگاڑ دو۔"
آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔
اگر اخلاق و محاسن کے معنی وقت کے ساتھ بدلنے والے اصولوں
کے نہیں ہیں تو محاسن کو ثابت کرنے کے لئے جنگ کرنی چاہیئے شروع
سے تمام مصلحین و انبیاء نے یہی کہا ہے اور یہی حکم خدا بھی ہے۔

واقعی عمر کے لحاظ سے عبید بڑا ہی چالاک دستفنی واقع ہُوا تھا.
اس میں شک نہیں کہ پڑھنے میں بھی اتنا ہی تیز تھا جتنا دوسری باتوں میں.

یہی وجہ تھی کہ وہ کلاس میں ہیرو بنا ہُوا تھا۔ اسی بنا پر اپنی جماعت کے تقریباً تمام لڑکوں پر اس کا اثر تھا.

پھر حرکات بھی ایسی کرتا تھا کہ نوجوان یا معمّر لوگ تک اُس کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے تھے.

جو بات ایجاد کرتا نئی، جو پروگرام بناتا اچھوتا۔ اسی وجہ سے

لڑکے اس کا دم بھرتے تھے اور مرعوب بھی تھے۔

فرید پر اس کا اس قسم کا کوئی اثر نہ تھا۔ ایک تو فرید اونچی جماعت میں تھا۔ دوسرے وہ کسی کے رعب وداب میں آنے والا لڑکا نہ تھا۔

صفیہ نے اس روز نمائش میں اسے محض ٹالنے کے طور پر اپنے مکان پر آنے کی دعوت دی تھی مگر وہ تیسرے ہی روز شام کو اس کے مکان پر جا پہنچا۔

اب صفیہ ایک لڑکے کو مکان کے اندر بلا کر بڑے آدمی کی طرح اس کی تواضع تو کرنے سے رہی۔ بہرحال اس نے باہر برآمدے میں اسے بٹھا دیا اور اس کے سامنے چند تصاویر کے رسالے لا ڈالے۔

عبید نے ایک رسالہ اٹھا کر اسے الٹ پلٹ کرتے ہوئے کہا۔

ان سے اچھے رسالے تو ہمارے ہاں آتے ہیں، وہ بھی مُفت۔

صفیہ سنی اَن سنی کرتی ہوئی اندر چلی گئی۔

شمی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ممکن ہے مکان کے اندر ہو۔ کس سے دریافت کرتا۔

بہرحال ڈھٹائی سے اکیلا باہر برآمدے میں بیٹھا رہا۔

صفیہ نے اس سے دریافت کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ کیسے

آیا ہے۔ کیا کام ہے؟

آخر برآمدے سے اتر کر ٹہلتا ٹہلتا سڑک کے کنارے جا پہنچا۔ شاید وہ شمی کو تلاش کر رہا تھا۔ چند منٹ بعد اس طرف سے ایک ٹرک گزرا۔ کوئی بڑا سا اور بند ٹرک تھا جس کے اندر نامعلوم کیا مال بھرا ہوا تھا۔

عبید نے ٹرک ڈرائیور سے زور سے کہا۔

ارے رزاق چچا! کدھر سے آرہے ہو ٹرک لے کر؟

یہ وہی گنجا تھا۔

گنجے نے ٹرک روک کر اس سے کہا۔

اوہو عبید میاں! تم یہاں کہاں؟

عبید نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

میں تو یہاں آتا ہی رہتا ہوں۔

گنجے نے دریافت کیا۔

کس کے پاس؟ مشرف سے ملنے؟

اب عبید چکرایا کہ مشرف کون ہے۔ آخر اسے خیال آیا کہ مشرف مالک مکان یعنی شمی کے والد کا نام ہو گا۔

عبید نے اس کے سوال کو ٹالتے ہوئے پوچھا۔

ہاں ایسے ہی سب سے ملنے۔ اچھا تم کہاں جا رہے ہو؟
گنجے نے کہا۔
میں اسی محلہ میں رہتا ہوں۔ یہاں سے تھوڑے سے فاصلے پر میرا مکان
ہے۔ آؤ دیکھ لو میرا مکان بھی آ کر۔
علید نے بہانہ کرتے ہوئے۔
پھر آؤں گا۔ اس وقت تو مجھے ایک لڑکے سے کتابیں لینا
ہے
گنجے نے ہنس کر کہا۔
مشرف کے تو کوئی لڑکا نہیں۔ ہاں ایک خوبصورت لڑکی ہے
کہوں گا تیرے باوا سے۔
علید نے ہنس کر کہا۔
تم نہ جلنے کیا اڑانے لگے۔ جاؤ اپنا کام کرو۔
گنجا بھی ہنستا ہوا اپنا ٹرک بڑھا کر چلا گیا۔
بیٹا لونڈیا کی تاک میں ہے اور باوا لونڈیا کی اماں پر میرے
ذریعہ قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ بڑا مزہ رہے گا۔ گنجہ سوچتا ہوا جا
رہا تھا۔
سستی سے مایوس ہو کر علید جانے ہی والا تھا کہ سڑک کے

دوسرے کنارے پر وہ آتی ہوئی نظر آئی۔ اس کے ساتھ اس سے ذرا بڑی ایک بھدی سی لڑکی اور تھی۔

شمی کے قریب آنے پر عبید نے اس سے کہا۔

او ہو شمی! اب آرہی ہو اسکول سے؟

شمی نے ترشروئی سے جواب دیا۔

ہاں! تمہیں اس سے کیا؟

میں سوچ ہی رہا تھا کہ تم نامعلوم کس وقت اسکول سے آتی ہوں گی۔ مایوس ہو کر جا رہا تھا۔ تم ایک دم کدھر سے نکل پڑیں۔ میں تو کافی دیر سے یہاں کھڑا ہوا ایک دوست سے باتیں کر رہا تھا۔

شمی نے اسی طرح جواب دیا۔

وہ سامنے کی گلی نظر نہیں آتی تمہیں؟

اس نے بھی یہ دریافت کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ کیوں آیا ہے؟

عبید نے پوچھا۔

روزانہ اسی راستے پر آتی ہو؟

شمی نے اس کے مہمل سوال پر چڑ کر کہا۔

نہیں تو۔ روزانہ تو عمارتیں پھلانگتی ہوئی آتی ہوں۔

اور اپنے مکان کے احاطہ میں آگئی۔

عبید نے ہنس کر کہا۔

کیوں نہیں۔ تم اڑ سکتی ہو، کیونکہ پری ہو۔

اور اس کے حجاب ڈھلے ہوئے دیدوں میں اور بھی زیادہ بے حجابی پیدا ہو گئی۔

شمی نے اپنی حسین تیوری پر بل ڈال کر کہا۔

تم بھی شاید کوئی دیو یا بھوت ہے۔

اور مکان میں جانے لگی۔

عبید نے ڈھٹائی سے دریافت کیا۔

میں نے کہا آج نمائش میں آؤ گی؟

شمی نے کہا۔

جاؤ اپنا راستہ لو۔

اور خوش رنگ تتلی کی طرح لہراتی ہوئی مکان میں داخل ہو گئی۔

شمی کے چلے جانے کے بعد عبید نے خود سے کہا۔

اچھا جانِ من! کسی بھی روز سہی۔

اور روانہ ہوا۔

آگے جاکر عبید ایک ٹھیلے والے کے پاس رکا جس میں کئی قسم کے پھل لدے ہوئے تھے۔ پھلوں کو دیکھ کر للچایا۔

عبید نے دو تین سیب اٹھاکر دریافت کیا۔

سیب کیسے دیئے بڑے میاں؟

اور واپس رکھتے ہوئے انہیں سے ایک سیب اڑا لیا۔ مگر پیچھے سے پولیس والے نے دیکھ لیا۔

پولیس والے نے عقب سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو کانسٹیبل کو سر پر پایا۔ چنانچہ جلدی سے دوسرے ہاتھ سے ایک روپے کا نوٹ چپکے سے کانسٹیبل کو دے دیا۔ اس نے بخوشی قبول کر لیا۔

ٹھیلے والے نے دریافت کیا۔

کتنے سیب دے دوں میاں؟

وہ اس تمام کارروائی سے بے خبر تھا۔

عبید نے کہا۔

اب پھر لیں گے۔

اور چل دیا ٹھیلے والا بھی بڑبڑاتا ہوا روانہ ہوا۔

عبید نے مسکرا کر سپاہی سے کہا۔

بڑا مہنگا پڑا یہ سیب۔
سپاہی نے کہا۔
شکر کرو کہ ایک روپے پڑ گئی، نہیں تو چھ مہینے کے لئے جاتے۔
عبید مشیخت سے بولا۔
یہ نہ کہنا، میرے بڑے لمبے ہاتھ ہیں۔
کیا کام کرتا ہے تمہارا والد؟ وہ بھی یہی دھندا کرتا ہوگا۔
سپاہی نے رشوت تو لی مگر دانستہ طور پر اس کے منہ سے سچی بات نکل گئی۔
عبید نے کہا۔
تم نہیں جانتے میرے والد کو؟ خان بہادر کریم الدین کا نام نہیں سنا تم نے؟
سپاہی نے کہا۔
مر گئے سارے خان بہادر۔
اور مزید کمائی کے لئے کسی اور طرف چل دیا۔
عبید نے سیب پر دانت مارتے ہوئے خود سے کہا۔
سیب تو میٹھا ہے شہد کی طرح۔

چند روز میں کشتی تو میرے قدموں پر ہو گی۔ نہیں میری آغوش میں۔ تو لاکھ گڑگڑائے گی مگر مجھے رحم نہیں آئے گا۔

عبید نے آدھا سیب کھا کر سڑک پر پھینکتے ہوئے کہا۔

پھر اس نے اس گلی کا موقع دیکھا جس میں سے کشتی آتی جاتی تھی۔ وہاں ایک شخص بیٹھا ہوا پیشاب کر رہا تھا۔ گلی کی کچی پکی زمین پر بے شمار پیشاب کی لمبی لمبی لکیریں بنی ہوتی تھیں۔ یہی سڑکوں کے کناروں کی حالت بھی تھی۔

عبید بھی وہیں پیشاب کرنے بیٹھ گیا۔ اس میں غضب کیا ہو گا۔ ہر شہری یہی کرتا ہے۔ جانور شہری۔

اب عبید نے تقریباً روزانہ ہی صفیہ کے چکر کاٹنے شروع کر دیئے۔

یہ صرف شمّی کی خاطر تھا۔ اس نے روزانہ آکر اندازہ لگایا کہ شمّی ہر روز اسی گلی میں سے نکل کر سڑک پر آتی تھی اور اسے پار کر کے مکان میں داخل ہوتی تھی۔

اور اس نے یہ بھی دیکھا کہ روز ہی وہی بھدّی سی لڑکی شمّی کے ہمراہ ہوتی تھی۔ اس نے پہلے تو یہ سوچا کہ شمّی کی خاطر اس بھدّی لڑکی سے بھی راہ و رسم پیدا کرے مگر پھر یہ خیال بدل دیا۔

عبید صفیہ کے مکان سے ذرا دور ہی چکر لگاتا رہتا تھا۔ صفیہ سے نہیں ملتا تھا۔ البتہ شام کو آتی ہوئی کشتی کی جھلک ضرور دیکھ لیتا تھا۔

بعض اوقات اسے سلام بھی کھینچ کر مارتا مگر وہ رُخ تک نہیں ملاتی۔

گنجے نے بھی ایک دو بار اسے سڑک پر دیکھا تھا مگر گنجا اپنے کالے کاروبار میں اتنا مصروف تھا کہ عبید سے بات چیت نہ کر سکا تھا۔

اپنے کسی پروگرام سے عبید نے چند روز بعد اپنے رازدار لڑکوں کو بھی آگاہ کر دیا اور ان تمام لڑکوں نے اس کی مدد کرنے کا وعدہ کیا۔

صرف ایک لڑکا جس کا نام بشیر تھا اور جو بظاہر عبید کا ہم ساز بنا ہوا تھا۔ اس کے کسی مخدوش ارادہ سے اتفاق نہ کر سکا مگر اس نے اپنے عدم اتفاق کو راز میں رکھا۔

بشیر کچھ ڈرپوک قسم کا لڑکا تھا۔ اسی وجہ سے وہ عبید کی مہمات میں شریک ہونے سے ڈرتا رہتا تھا۔ اس کے برعکس اسے فرید پسند تھا مگر عبید کے خوف سے فرید سے کم ملتا تھا۔

ایک روز بشیر نے فرید سے کہا۔

میاں فرید! آج کل تم عبید کے ساتھ نظر نہیں آتے ہو۔
فرید نے کہا۔
وقت نہیں ملتا۔
اس نے یہ کہنا مناسب نہ سمجھا کہ آج کل اس کے تعلقات عبید سے اچھے نہیں رہے ہیں۔
بشیر نے مسکرا کر کہا۔
یا اس کی عادتوں سے بیزار ہو گئے ہو؟
فرید بولا۔
کیا عادتیں پیدا ہو گئی ہیں اس میں؟
بشیر نے مسکرا کر کہا۔
پیدا نہیں ہوئی ہیں بلکہ پرانی ہیں۔ وہ لڑکیوں کا تعاقب نہیں چھوڑتا، اور تم ان چیزوں سے دور ہو۔
فرید خاموش ہو گیا۔
بشیر بولا۔
فرید ایک بات کہوں۔ کسی سے ذکر تو نہیں کرو گے؟
فرید نے دریافت کیا۔
کیا بات ہے؟

تم نے شاید صفیہ کو دیکھا ہو گا۔ کافی خوبصورت عورت ہے۔
اس کی ایک بہت حسین لڑکی بھی ہے۔

فرید نے کہا۔

معاذ اللہ! تم لوگوں کے پاس کیا اس کے علاوہ کوئی دوسرا موضوع نہیں۔

بشیر نے کہا۔

یہ میرا موضوع نہیں ہے۔ بھائی! بلکہ عبید کا ہے۔ وہی آج کل ایک لڑکی کے پیچھے پڑا ہوا ہے

فرید کو یہ معلوم تھا کہ عبید نے اس زمانہ میں کس لڑکی کو تاک رکھا تھا۔

اس نے خاموشی اختیار کی۔

بشیر نے کہا۔

میں تم سے یہ کہنا چاہتا تھا کہ عبید ایک دو روز میں ایک خطرناک کھیل کھیلنے والا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ پرسوں تک اس لڑکی کا اغوا نہ کر لے۔

فرید چونک اٹھا مگر بشیر کی اصلاح خیال کے لئے بولا۔
تمہارا خیال غلط ہے۔ عبید ایسی جرأت نہیں کر سکتا۔

بشیر نے کہا۔

خدا کرے میرا خیال غلط ہی ہو۔

عبید نے اپنے کسی پروگرام کا بھید بشیر کو نہیں دیا تھا۔ اس لئے بشیر عبید کے عزائم کے بارے میں شک و یقین کی حالت میں تھا۔ اس کان میں صرف اتنی بھنک پڑی تھی کہ عبید ایک دو روز میں کسی لڑکی کو اُڑانے کی فکر میں ہے۔

فرید نے پہلے تو بشیر کی اس اطلاع کو کوئی اہمیت نہیں دی مگر بعد میں بعد خیال آیا کہ عبید سے کچھ بعید نہیں۔ وہ سب کچھ سکتا ہے۔ کیونکہ شہری، سماجی اور مذہبی قوانین کی اس کی نظر میں کوئی وقعت نہ تھی۔

اب فرید کو شمی کی فکر لاحق ہوگئی۔

فرید اگرچہ عام نوجوانوں کی طرح عیش کوش اور معاشقہ باز لڑکا نہ تھا مگر اسے شمی کی نامعلوم کونسی ادا بھا گئی تھی کہ وہ اکثر اس کے مطالعہ تک کے دوران میں یاد آئے بغیر نہیں رہتی تھی۔

نو عمر جسموں میں نوجوانی کی کلی جب چٹکتی ہے تو ان پر ایک عجیب خمار سا طاری ہو جاتا ہے اور ان کی وہی کیفیت ہو جاتی ہے جو ایک شرابی کی ہوتی ہے۔ شرابی بحالتِ نشہ ہر کچھ کر گزرتا ہے۔ اسی طرح گلستانِ جوانی میں قدم رکھنے والا انسان بھی بے قابو ہو جاتا

ہے۔ اب اگر اس کی تربیت اور سوسائٹی اچھی ہو تو وہ ناجائز باتوں سے بچ نکلتا ہے ورنہ بے مہار ہو جاتا ہے۔

فرید کی عمر چودہ سال کی تھی۔ نوجوانی کے پہلے ہی جھونکے نے اس کے پاؤں بھی اکھاڑ دیئے تھے مگر اپنے گھر کی تادیب پسند اور اچھے ماحول نے اسے سنبھال لیا اور سنبھلنے کے چند ماہ بعد ہی اسے مغرور مگر حسین ظاہر کی مالک ہستی شمی نظر آگئی جسے دیکھ کر اس نے سوچا کہ ایسی ہی صورتیں قبلہ کے ٹیڑھے پن کو سیدھا کر سکتی ہیں۔

مگر اس ہستی کو دیکھ کر عبید نے اپنا قبلہ ٹیڑھا کر لیا تھا۔

حقیقتاً عبید کسی قبلہ کا پابند ہی نہ تھا۔ اس لئے کج روی وراست روی کے اس کے نزدیک کوئی معنی ہی نہیں رہے تھے۔

غرض شمی کے بارے میں عبید کے بُرے ارادے بشیر سے معلوم کر کے فرید پریشان سا ہو گیا تھا مگر وہ سر دست کیا کر سکتا تھا۔

عبید کی طرح وہ صفیہ سے ملا نہ تھا اور اگر اس سے مل کر شمی کے بارے میں اسے خبردار کرتا تو اس میں یہ قباحت تھی کہ صفیہ کا شبہ اس پہ جاتا۔ کیونکہ صفیہ کے خیال میں فرید آخر عبید ہی کا دوست تھا۔

دوسری رکاوٹ یہ تھی کہ بشیر کی اطلاع کو وہ سند کے طور پر قبول

نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ بشیر بھی آخر عبید ہی کی سوسائٹی کا لڑکا تھا۔ ممکن ہے اس کی لڑائی عارضی طور پر ہو گئی ہو اور وہ شمی کا افسانہ گھڑ کر عبید سے انتقام کا خواہاں ہو۔

چنانچہ فرید نے ان موانع کی بنا پر شمی کے تحفظ میں کچھ نہ کر سکا۔ بس اس کے امکان میں اتنا تھا کہ عبید کے اقدامات پر نظر رکھے۔ چنانچہ اس نے یہی کیا۔

ادھر ایک شام کو آخر عبید نے اپنے چار ساتھیوں کو لے کر بارادہ فاسد حنیفہ کے مکان پر روانہ ہوا۔ آج بوندا باندی کی وجہ سے لوگ جلد جلد اپنے ٹھکانوں پر راہی ہو رہے تھے۔ اس لئے سڑک اور بالخصوص اس گلی میں جس سے شمی اسکول سے آتی تھی تقریباً سناٹا تھا۔

عبید نے پہنچتے ہی اپنے دو ساتھیوں کو اس پر کھڑا کر دیا اور ایک ساتھی کو لے کر گلی میں داخل ہو گیا۔ فرید بھی سایہ کی طرح لگا ہوا تھا مگر دور تھا تاکہ عبید اور اس کے دوستوں کو نظر نہ آئے۔

آخر مقررہ وقت سے چند منٹ بعد شمی طویل گلی کی راہ سے اپنے مکان کی طرف جانے کے ارادے سے اس کوچے میں داخل ہوئی۔ آج بھی اس کے ساتھ وہی بھدی سی لڑکی تھی۔

عبید نے شمی کو دیکھا اور مسکراتا ہوا اس کے قریب آیا۔
بارش کی بوندیں تمہارے بالوں میں موتی کی طرح نظر آرہی ہیں۔
عبید نے کہا۔
اور اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔
شمی نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کے آثار نہ تھے بلکہ حقارت جھلک رہی تھی۔ وہ یہ تو گمان تک نہیں کر سکتی تھی کہ عبید کی نیت میں فتور ہے۔ پھر ویسے بھی نڈر لڑکی تھی۔

ششی نے ایک طرف ہٹتے ہوئے کہا۔
کیا بات ہے۔ پھر پیسے قرض لینے آئے ہو؟
عبید نے کہا۔
تم کیا پیسے قرض دو گی بلکہ اس روز میں نے تمہاری ماں کو پیسے اُدھار دیئے تھے۔
اور پھر اس کی راہ میں جا کھڑا ہوا۔
ششی نے کہا۔
اچھا راستہ چھوڑو۔ بڑا آیا اُدھار دینے والا۔

عبید نے ہنس کر کہا۔
اگر ذرا آنچل ہٹا دو تو سو روپے دیتا ہوں۔
ستی نے غصہ سے کہا۔
لو کافر کہیں کا۔ ذرا میر البتہ تھامنا آخری۔
شاید اس کا ارادہ چپل اتارنے کا تھا۔
عبید نے کہا۔
دیکھو ستی! اب پروگرام یہ ہے کہ جہاں میں لے جاؤں، تم میرے ساتھ چلوگی۔ میری اور تمہاری جوڑی بڑی اعلیٰ درجہ کی رہے گی۔
ستی کو تاؤ ہی تو آگیا۔ اسے مارنے کو پتھر اٹھانے کے لئے جھکی مگر عبید نے لپک کر اسے گود میں اٹھا لیا اور اس کے ساتھی نے اس کی ٹانگیں پکڑ لیں۔
ستی پوری قوت سے ان دونوں کے ہاتھوں میں تڑپی اور نکل بھاگی مگر ان دونوں نے اسے پکڑ لیا۔
اب ستی گلی میں واپس بھاگی مگر اس دفعہ عبید اور اس کے دوست نے مضبوطی سے اسے تھام کر اٹھا لیا۔
آخر خود کو بے بس پا کر ستی چیخی لیکن گلی کے دوسرے نکڑ پر کھڑے

ہوئے عبید کے وہ دونوں ساتھی بھی لپک کر اندر آ گئے اور اسے ہاتھوں پر اٹھا کر گلی کے باہر بھاگے۔

اختری دشتی کے ساتھ بھدی سی لڑکی اچیختی ہوئی ان کے پیچھے دوڑی ادھر سے فرید لپک کر گلی میں آیا۔

اختری کو امداد کے لئے جو پہلا شخص نظر آیا اسی سے سراسیمگی سے بولی۔

بچاؤ، بچاؤ وہ موذی کشمی کو اٹھا کر لے گئے۔

فرید لپک کر ان کے پیچھے دوڑا۔

گلی کے اس طرف چند جھونپڑیاں تھیں کشمی کی چیخ پکار سن کر چند جھونپڑی والے نمازیں پڑھتے ہیں۔ روزے بھی رکھتے ہیں اور ان میں جو نوجوان ہیں، وہ اپنی جہالت کی وجہ سے لڑکیوں کا اغوا بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ ان جھونپڑی والوں میں تماشہ بیں زیادہ تھے، امداد کرنے والے کم۔

بہر حال دو تین جھونپڑی والوں نے پیچھا کر کے عبید اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھوں سے کشتی کو نکالنا چاہا مگر عبید کے دوستوں نے ان پر پتھر برسانے شروع کئے۔

اتنے میں فرید لپک کر دو سپاہیوں کو بلا لایا۔

سپاہیوں کو دیکھ کر عبید کے دو دوست تو بھاگ چھوٹے۔
اب عبید اور اس کے ایک ساتھی نے بھی شمی کو چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کرنی چاہی مگر پکڑے گئے۔
شمی نے اپنے کپڑے درست کرتے ہوئے غصہ سے عبید سے کہا۔
دیکھنا موذی اب کیسی جیل کی ہوا کھاتا ہے۔
پھر سپاہی سے بولی
اسے کیوں چھوڑ دیا تم نے۔ یہ بھی تو اسی پاجی کا ساتھی ہے۔
اس نے فرید کی طرف اشارہ کر کے کہا۔
سپاہی ہنسنے لگے کیونکہ فرید ہی تو ان کو مدد کے لئے بلا کر لایا تھا۔ بہرحال شمی کی اس بابت میں لاعلمی کا لطف لینے لگے۔
سپاہی نے ہنستے ہوئے شمی سے کہا۔
اچھا اب چلو۔ کہاں رہتی ہو تم؟ غصہ میں تمہارے گال اور لال لال نظر آنے لگے۔
شمی نے کہا۔
میں خود چلی جاؤں گی اپنے مکان پر۔
سپاہی نے کہا۔

واہ! ہمیں رپٹ بھی تو لکھنا ہے۔

اب فرید بولا۔

ہاں ٹھیک تو ہے۔ اس سپاہی کو اپنے مکان پر لے جا کر آپ اپنا بیان لکھوا دیجئے۔

سشمی نے اسے ڈانٹا۔

تم خاموش رہو۔ ہٹ جاؤ میرے سامنے سے۔

وہ بیچارہ حیرت سے اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

سپاہی نے سشمی سے کہا۔

اس بیچارے کے سامنے کیوں پڑ گئیں۔ چلو مجھے اپنے مکان پر لے چلو۔ یہ بھی میری مہربانی ہے کہ تمہیں اپنے عاشق کے ساتھ ہی پولیس اسٹیشن تک نہیں گھسیٹ رہا ہوں۔

سشمی نے سپاہی سے کہا۔

تم ذرا انسانیت سے بات کرو۔ میرا اس ذلیل شخص سے کوئی واسطہ نہیں جسے تم نے ابھی گرفتار کیا ہے۔

سپاہی پھر ہنسا جیسے اس معاشقہ کی رمز اس کے ہاتھ آ گئی ہو۔

فرید نے اس دفعہ پھر سشمی کی مدافعت میں زبان کھولی۔

ہاں ان کا اس شخص سے کوئی واسطہ نہیں.
حالانکہ وہ اسے ابھی ابھی ڈانٹ چکی تھی۔
شمی نے پھر غریب فرید کو ڈانٹ بتائی.
"تم سے کس نے کہا ہے کہ میری وکالت کرو. چور کا ساتھی بھی چور ہی ہوتا ہے۔
دوسرا سپاہی ایک دو آدمیوں کی مدد سے عبید اور اس کے ساتھی کو لے کر تھانہ پر روانہ ہوگیا اور اس سپاہی کو شمی اپنے مکان پر لے گئی۔
فرید کو چونکہ وہ دو دفعہ ڈانٹ چکی تھی۔ اس لئے وہ مایوس سا نہ روانہ ہوا۔
سے سخت رنج تھا کہ شمو اس کو بھی عبید کے بدکردار ساتھیوں میں سے سمجھتی ہے.
شمی اب تک بڑے حوصلہ و سکون سے کام لے رہی تھی، لیکن مکان پر قدم رکھتے ہی اپنی ماں سے لپٹ کر بچی کی طرح رونے لگی.
شاید اس چیز سے اس کا دل بھر آیا تھا کہ اگر لوگ مدد نہ کرتے تو وہ غنڈا نامعلوم کیا اس کا حشر کرتا۔

شمی کا دولہا ابھی تک مکان پر نہیں آیا تھا۔
صفیہ کو جو تمام واقعہ کا علم ہوا تو اس کا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ خدایا! یہ کیسی حکومت ہے۔ یہ کیسا قانون ہے کہ کوئی عورت غنڈوں سے نہیں بچ سکتی۔
صفیہ ایک باعزت آدمی کی بیوی تھی۔ رسوائی کے خوف سے اس کی بری حالت ہوگئی۔ پھر میاں گھر پر نہ تھا کہ سپاہی سے بات کرتا۔
سپاہی نے صفیہ سے دریافت کیا۔
کیا وہ لڑکا آپ کے مکان پر آتا رہتا ہے؟
صفیہ نے سپاہی کو جواب دیا۔
دیکھئے! اگر کوئی بیہودہ شخص کسی کے مکان کے چکر لگانے لگے تو اسے اس کا آنا جانا نہیں کہا جاسکتا۔ وہ ذلیل لڑکا بھی اسی طرح ہمارے مکان کے چکر کرنے لگا تھا۔
سپاہی نے کہا۔
اچھا! آپ کو شوہر آجائے تو اسے تھانہ میں بھیج دینا۔
اور چلا گیا۔
سپاہی کے چلے جانے کے بعد اب صفیہ کو یہ خوف ہوا کہ

اس واقعہ نامعقول سے باخبر ہونے کے بعد اس کا شوہر غصہ میں کہیں کوئی سخت قدم نہ اٹھا بیٹھے لیکن یہ بھی تو نہیں ہو سکتا تھا کہ اس واقعہ کو اس سے چھپایا جائے۔

آخر شام کو سات بجے کے بعد صفیہ کا شوہر مکان پر آیا تو اسے چائے وغیرہ پلانے کے بعد صفیہ نے پہلے اسے محبت سے رام کیا۔ پھر جستہ جستہ آج کا واقعہ سنا دیا۔

وہی ہوا جس کا صفیہ کو خوف تھا۔

اپنی عزت پر ایسے ناپاک حملہ سے باخبر ہوتے ہی مشرف غصہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور سیدھا تھانے پہنچا۔

وہاں عبید کے خلاف اس نے پوری رپورٹ درج کرائی۔ اس کے پولیس سے عبید کے والد کریم الدین کے مکان کا پتہ دریافت کر کے غصہ سے کپکپاتا وہاں پہنچا۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ یہ نام کا خان بہادر کریم الدین سماج دشمن عناصر کا سرغنہ تھا۔

مشرف، اس کی بیوی اور معصوم بیٹی کے لئے اس نے اندر اس کے سیاہ کار ساتھیوں نے سخت نا ملائم الفاظ استعمال کئے۔ قریب تھا کہ لڑائی ہو جاتی مگر محلہ کے لوگوں نے بیچ بچاؤ کر دیا۔

پھر بھی مشرف کی زبردست بدمعاشوں سے دشمنی ہو گئی۔

پٹی والے شخص نے خان بہادر کریم سے کہا۔

لو جی شکار خود جال میں آ گیا۔ اسی کی تو بیوی ہے۔ وہ حسین عورت جس کے لیئے تمہاری آغوش تیار کی جا رہی ہے۔

گنجا مسکرا کر بولا۔

میں تو پہلے ہی تمہارے لونڈے کو اس محلہ کے چکر کاٹتے دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ وہ کسی شکار کی تلاش میں ہے۔ باپ سے تو بیٹا ہی بہادر ثابت ہوا کہ اپنا کام کر گذرا اور باپ ابھی بیٹھا ہوا منصوبے ہی باندھ رہا ہے۔

کریم نے کہا۔

مذاق! تم اسی وقت پانچ ہزار روپے لے کر تھانہ میں جاؤ اور
پولیس کو روپیہ دے کر میرے لڑکے کو چھڑا لاؤ۔

پٹی والے شخص نے پوچھا۔

پانچ ہزار کیا ضمانت کے؟

ٹھگنے نے اس سے کہا۔ پھر کریم سے بولا۔

نہیں بے پولیس کے نذرانہ کے لئے۔

لاؤ پانچ ہزار مجھے دو۔ میں ابھی جاتا ہوں اور عبداللہ (پٹی والا شخص)
کو بھی ساتھ لے جاؤں گا۔

کریم نے کہا۔

حاجی موسیٰ کے پاس سے آج کے مال ہی سے لے جاؤ۔

پٹی والے شخص نے کہا۔

کہیں حاجی موسیٰ جوئے میں نہ ہار گیا ہو روپے؟

کریم نے کہا۔

کہاں تک ہارے گا۔ کئی لاکھ کا سونا پرسوں ہی تو آیا ہے۔ اس
کے بدلے چاول، پٹسن اور گیہوں سرحد پار پہنچ گیا ہے۔
ویسے بھی پولیس اور اس کے بہت سے افسر خان بہادر کریم کے

وظیفہ خوار تھے اور اس کا قانون پر کافی قبضہ تھا۔ اگر وہ رشوت کے روپے پولیس کو نہ بھی بھیجتا تب بھی صرف اپنے اثر ہی سے عبید کو رہا کرا سکتا تھا۔

غرض گنجے اور پٹی والے شخص نے پانچ کے بجائے آٹھ ہزار روپے حاجی موسیٰ سے لئے اور ساڑھے تین ہزار فی کس آپس میں تقسیم کرنے کے بعد صرف ایک ہزار پولیس کو نذر کر کے عبید کو قانون سے چھڑا لیا۔

انہی حالات میں شریف کیا اور امیر و غریب کیا کسی کی عزت ملک میں محفوظ نہ رہی تھی۔ قانون کوڑیوں کے مول بکتا تھا۔ لاقانونی حکمرانوں کی مرضی و خواہش سب سے بڑا قانون تھا۔

غنیمت تھا کہ شمسی کی آبرو بچ گئی تھی ورنہ مفت میں تباہ ہوتی۔ کیونکہ اس کی آبرو ریزی کے درپے جو شخص تھا وہ باوجود اقدام جرم کے اثر اور روپے کے ذریعہ صاف بچ نکلا تھا۔

مشرف، اس کی بیوی اور بیٹی ہی پر موقوف نہ تھا۔ اپنے ہی ملک میں ہر شخص اپنوں ہی کے ہاتھوں تباہ ہو رہا تھا!

برباد کیا جا رہا تھا!

لٹ رہا تھا!

لوگ جرم پسندی و گناہ کے عادی اس قدر ہو چکے تھے کہ ضرورتاً

یا احتیاج کی بنا پر جرم نہیں کرتے تھے بلکہ صرف لذّت جرم و گناہ کی خاطر ان سے لاقانونی حرکات و افعال سرزد ہوتے تھے۔ ان کے ذہن پراگندہ ہو گئے تھے۔ خیالات پست ہو گئے تھے اور روحیں سڑ گئی تھیں۔

اس دورِ تاریک اور اس عہدِ نامسعود میں ہر شخص عفریت بن گیا تھا۔

کسی خاموش گلی میں سے کوئی آدمی چاقو و خنجر کا زخم کھائے بغیر نہیں گزر سکتا تھا۔

کوئی عورت کسی کوچے میں اپنی عزت گنوائے بغیر نہیں جا سکتی تھی۔

صفیہ یا اس کی بیٹی شمسی کا تو سنسار و قطعاً ہی کیا تھا۔

پوری مملکت کے یہی حالات تھے۔ سیاسی بازیگر اپنے اپنے سیاہ کرتبوں میں محو تھے اور عوام ان کا اثر قبول کر کے اپنے کالے افعال میں پھنسے ہوئے تھے۔

عورتوں کے اغوا کے جس قدر ذلیل واقعات ہمارے ملک میں شب و روز ہوتے رہتے ہیں۔ ایسے دنیا کے کسی ملک میں نہیں ہوتے اور اس کا ارتکاب نہ تھا۔ مخش کار افراد ہی نہیں کرتے بلکہ موقع لگے تو اس سے سہم شاکبھی چوکنے والے نہ تھے۔

شلواروں اور پتلونوں میں نفس ناپاک جس قدر اس ملک میں تڑپتا ہے، اس کی مثال کسی دوسری جگہ نظر آنا مشکل ہے۔

ناپاک و خبیث لوگوں کی نگاہ میں یہاں عورت کا فقط ایک ہی مصرف ہے جس طرح دُنبے یا بکری کی جان قصائی کے رحم و کرم پر ہے۔ اسی طرح عورت کی عزت و آبرو پر یہاں شیاطین کا قبضہ ہے۔

اور کہیں نہ ان کا قبضہ ہے۔ یہاں اغوا کی پاداش تو ہے مگر اس کے سدِ باب کا کوئی طریقہ موجود نہیں ہے۔

کسی سبیل کا وجود نہیں ہے۔ قانون اگر محض قانونی کتابوں یا عدالت تک محدود ہو تو وہ قانون نہیں۔

قانون تو ایک بے مہر، بے رحم!

بے لاگ!

اور پُر وقار قوت کا نام ہے جس کے ہاتھ میں آہنی ڈنڈا ہوتا ہے۔

قرونِ اولیٰ میں چوری کی سزا ہاتھ کاٹ ڈالنا تھا۔ اس قانون کے نفاذ کے بعد کتنے ہاتھ کٹے نظر آنے لگے تھے؟ بہت ہی کم۔ اسی طرح اگر اس ملک میں اغوا کی سختی کے ساتھ سزا پھانسی مقرر کر دی جائے تو پھر دیکھنا ہے کہ کتنی عورتیں اغوا کی جاتی ہیں۔

کہیں پڑھا تھا کہ اتابک سعد زنگی شیراز کا ایک بڑا رحم دل و نیک بادشاہ گذرا ہے۔ اس کی رحمدلی کے نتیجہ میں منجملہ دوسرے جرائم میں اضافہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ حسینان شیراز کا بھی اغوا کرنے لگے۔ اتابک سعد زنگی نے تلقین کے ذریعہ اس سیاہ کاری کا انسداد کرنا چاہا مگر نتیجہ کچھ نہ ہوا۔ آخر مجبور ہو کر اغوا کی سزا اس نے پھانسی مقرر کی۔ اس کے بعد کہیں جا کر اغوا کی وارداتیں گھٹیں۔

ششی کے اغوا کا ارتکاب اور اس کے والد کو قتل کر کے اس کی زیدہ زیب ماں کو ایک سماج دشمن شخص کی آغوش معصیت میں پہنچانے کے ارادے کراچی کے ایسے ہی روزمرہ کے واقعات میں سے ایک معمولی سا واقعہ تھا۔ اس پر نہ تو قانون کو غصہ آ سکتا تھا اور نہ حکومت کو۔

ششی کے والدین کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوئی کہ اتنے بڑے جرم کا ارتکاب کر کے بھی عبید قانون کے شکنجے میں نہ آ سکا۔

وہ مطمئن تھے کہ چند روز بعد مجرم پر عدالت میں مقدمہ چلایا جائے گا اور وہ سزا پائے بغیر نہ رہے گا کیونکہ اس جرم کے شاہد موجود تھے۔

آزاد ہونے کے دوسرے روز ہی عبید حسب معمول نمائش میں تھا اور ممکن ہے اور پھر کسی دوسری قسم کے شکار کی تاک میں ہے۔

بہر حال کون جان سکتا تھا کہ یہ لڑکا پرسوں کا مجرم ہے۔
اسی طرح ایک شخص کسی انسان کو قتل کرنے کے بعد اطمینان سے اپنے خون آلودہ ہاتھ، چھری اور کپڑے صاف کر کے بڑی آزادی سے آپ کے اور ہمارے درمیان آ کر چلنے پھرنے لگتا ہے۔
عام آزاد شہری کی طرح ہوٹلوں میں بیٹھ کر چائے پیتا ہے۔ سینما دیکھتا ہے۔ اس کے سر پر سوار ہو کر نہ تو خون بولتا ہے اور نہ قانون اس پر رنڈناتا ہے۔

اس واقعہ کے دوسرے روز صفیہ نے شمی سے کہا۔
بیٹی! اب تم اکیلی اسکول نہ جایا کرو۔
شمی نے کہا۔
میں روز اسی طرح جاؤں گی امی۔ ابا مجھے جلدی سے پستول کا لائسنس دلا دیں۔ پھر دیکھئے میں چن چن کر ایک ایک مجرم کو نہ مار ڈالوں تو میرا نام شمی نہیں۔
باپ نے ہنس کر کہا۔
شمی بڑی بہادر لڑکی ہے۔ میں اسے ضرور پستول لا کر دوں گا۔

شمی کے واقعہ پر دو تین ماہ گزر گئے۔ وہ آزادی سے اسکول جا رہی تھی۔ اور اس نے اس روز کے بعد سے عجیبہ کی شکل نہیں دیکھی۔ ہاں البتہ اسے کبھی فرید نظر آجاتا تھا جسے دیکھ کر حقارت سے منہ پھیر لیتی تھی۔

غریب فرید مفت ہی میں شمی کی نگاہ میں مردود ہو گیا تھا۔ حالانکہ وہ بالکل ناکردہ گناہ تھا۔ بلکہ دیکھا جائے تو اسی نے سب سے پہلے شمی کی مدد کی تھی۔

دوڑ کر پولیس کو بلا لایا تھا مگر شمی کی نظر سے یہ سب چیزیں پوشیدہ تھیں۔ بس بدگمانی کے باعث اسے بھی وہ کمتر انسان سمجھنے لگی تھی

ایک دن خان بہادر نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔
ابے! تم سب بیکار لوگ ہو۔ میں کب تک لاکھوں کا مال اِدھر سے اُدھر کرتا رہوں۔ سونا، چاندی، کرنسی، اناج وغیرہ کے ذخیروں سے کھیلتا رہوں۔ ان کے علاوہ مجھے کسی دوسرے مشغلہ کی بھی ضرورت ہے۔

ایک شخص نے کہا۔
کیا حکم ہے سیٹھ بولو۔
خان بہادر کریم نے مسکرا کر کہا۔
اس گنجے اور عبدل کو معلوم ہے کہ میں کیا چاہتا ہوں؟
گنجے نے کہا۔
کریم بھائی! روز ہی تو ٹیکسی میں بٹھا کر تمہارے پاس سواریاں لائی جاتی ہیں۔ پھر بھی تمہارا دل نہیں بھرتا۔
کریم مسکرا کر بولا۔
جس روز سب چیزوں سے میرا دل بھر جائے گا، اس روز میں نہیں رہوں گا۔
ٹیکسی والے شخص نے کہا۔
لو رزاق بھائی! ہم تم کیسا جھگڑے ہیں۔ وہ حسین عورت تو رہی

گئی جس کی لڑکی کو ہمارے سیٹھ کے لڑکے نے پھانس لیا تھا۔
گنجے نے کہا۔
ہاں یار عبدل! تم نے اچھا یاد دلایا۔ گھر تو اس کا تم بھی جانتے ہو۔
پٹی والا شخص بولا۔
جانتا ہوں رزاق بھائی! پر یہ کام مجھ اکیلے پر نہ ڈالو۔
گنجے نے کہا۔
کریم بھائی کی خاطر میں بھی تمہارا ساتھ دوں گا۔ اس کام کی مصروفیت میں میرے دوسرے کاموں کا بڑا حرج ہو گا۔ کئی ہزار کا نقصان ہو جائے گا۔
خان بہادر کریم نے کہا:
میں تمہارے نقصان کی تلافی کر دوں گا۔ تم لاؤ اُسے۔
گنجے نے کہا۔
ایک دو روز ہی میں سنبھالو۔
پٹی والے شخص نے کہا۔
اچھا تو رزاق ایسا کریں۔ کل رات کو دس بجے سب کارروائی کر گزریں۔

گنجے نے جواب دیا۔

جیسی تمہاری مرضی۔

کریم نے کہا۔

مجھے بھی تو بتاؤ۔ کیا پروگرام ہے تمہارا؟

پٹی والے شخص نے کہا۔

کچھ نہیں بہت معمولی سی بات ہے۔ کل رات کو میں اور رزاق بڑی گاڑی لے کر اس عورت کے مکان پر پہنچیں گے۔ اس کا آدمی ضرور ہماری مزاحمت کرے گا۔ چنانچہ وہیں اس کا کام تمام کر کے اس عورت کو اٹھا لائیں گے اور گاڑی میں بٹھا کر ہوا ہو جائیں گے۔

کریم نے کہا۔

ہاں ٹھیک ہے مگر عبدل اور رزاق تم بھی اس ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس سے خبردار رہنا۔ کیا نام ہے اس کا۔ جاوید۔ وہ اپنے کو بڑا تیس مار خاں سمجھتا ہے۔ ایک وہی سالا میرے بس میں نہیں ہے۔ باقی سب کو اتنا کھلاتا پلاتا رہتا ہوں کہ وہ کمبخت نہال ہو گئے۔

پٹی والے نے کہا۔

اجی! تم نے بھی کس کا نام لیا ہے سیٹھ! اس کی کیا مجال ہے۔ کون سا وزیر ہے جو ہمارا ساتھ دینے سے انکار کر سکتا ہے۔

کریم نے کہا۔

ہاں یہ تو صحیح ہے لیکن ایک بات نہ بھولو۔ اس ملک میں راج بیشک ہمارا ہے اور ہم ہی جیسے بڑے لوگوں کا ہے مگر یہاں کی ملٹری بڑی بے تکی ہے۔

گنجے نے دریافت کیا۔

بے تکی سے کیا مطلب تمہارا؟

خان بہادر کریم نے خود ہی اپنے کسی اندیشے کی آپ تردید کرتے ہوئے کہا۔

یہ کہ وہ ملک کی بڑی وفادار ہے۔ ایسا نہ ہو کہ .... خیر ایسا ہو نہیں سکتا۔

پٹی والا شخص مسکرا کر بولا۔

اب یہ تم اپنے سائے سے بدکنے لگے ہو کریم سیٹھ۔

گنجے نے کہا۔

آدمی کو ہر طرف نگاہ رکھنی چاہیئے۔

کریم نے کہا۔

مجھے کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ اس ملک میں کچھ ہی عرصہ بعد ہم ہی جیسے لوگوں کا راج ہو جانے لگا۔

گنجے نے کہا۔

اب کیا ہمارا راج نہیں ہے۔ ملک کی تمام منڈیاں ہمارے ہاتھ
میں ہیں۔ جس چیز کو چاہیں اپنے من مانے داموں میں فروخت
کریں۔ یہاں کا یا باہر کا سونا، کپڑا، اناج غرض ہر چیز ایک منٹ میں
ادھر سے ادھر کر دیتے ہیں۔ حکومت کے سیکرٹریوں پر اپنا اثر،
پولیس اپنے قبضہ میں اور تمام وزیر اپنے۔ پھر کس بات کا ڈر ہے۔
کریم نے کہا۔

ہاں رزاق! بس فوج ہی اپنے قبضہ میں نہیں۔
گنجے نے کہا۔

اجی! فوج والے تو بہت دور بیٹھے ہوئے ہیں۔ تم تو یہ دیکھو کہ
یہاں کی حکومت کے لوگ اور حکومت کے باہر جو بڑی پارٹیاں ہیں
ان میں سب اپنے ہی آدمی ہیں۔ وہ بھی تو تمہارے ہی گرگے ہیں۔
مخلوط انتخاب سے دونوں بنگال کو ملا دیں گے۔ کیونکہ کانگریس کے
جلسہ میں ہندوستان اور روس کے لیڈروں کے نام کے گیت
ہمارے ہی آدمیوں نے گھڑے گئے تھے۔ دوسری طرف پختونستان
کا پروپیگنڈا کرنے والے جو لیڈر ہیں وہ بھی اپنے ہی آدمی ہیں اور ان
ہی بھائیوں کی مدد سے تو ہم لوگ لاکھوں کروڑوں کا مال اِدھر سے اُدھر

کرتے ہیں۔

کریم نے کہا۔

رزاق بھائی! اپنا بھید آپ نہ کھولو۔ دیوار ہم گوش دارد۔ تم تو اب اس عورت کو لانے کی کوشش کرو۔

پٹی والے شخص نے کہا۔

اسے رزاق کیا لائے گا، میں لاؤں گا۔

گنجے نے کریم سے کہا۔

کہو تو ہم نصرو کو بھی کل اس مہم کے لئے اپنے ساتھ لے جائیں۔

پٹی والے شخص نے کہا۔

ہاں! اس سے یہ فائدہ ہو گا کہ میں اس عورت کے آدمی سے نپٹ لوں گا۔ ادھر رزاق اور نصرو مل کر اس عورت کو اٹھا لائیں گے۔ پھر ہم تینوں کار میں ہوا ہو جائیں گے۔

خان بہادر کریم نے اپنے آدمیوں سے کہا۔

دیکھو! کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو میرا نام تم لوگوں کی زبان پر نہ آنے پائے۔

گنجے نے کہا۔

حلقہ کے تھانیدار اور سپاہیوں کے منہ پہلے ہی میں بند کر چکا ہوں۔

پٹی والا شخص مسکرا کر بولا۔
یہ تو بتاؤ استاد کہ اس عورت کی لونڈیا کو بھی اڑا لائیں کیا۔ بیچارہ عبید تو اس کے لئے تڑپتا رہ گیا۔
کریم نے کہا۔
نہیں ابھی نہیں۔
گنجے نے کہا۔
دیکھنا ہے عبدل! جاوید سے اگر مڈبھیڑ ہو جائے تو اس سے بچنا۔
پٹی والے نے گلاس بھر کر بیئر پیتے ہوئے کہا۔
جاوید کون؟ اچھا وہ ڈی ایس پی! اگر وہ میرے ہتھے چڑھ گیا تو مزا بتا دوں گا اسے۔

اس طرح اس گروہِ شیاطین نے بلا وجہ ایک معزز شہری کے گھرانے کو تاراج کر ڈالنے کی سازش مکمل کرلی۔ یہ تو ملک کے دوسرے ہزار ہا جرائم میں سے ایک معمولی سا اقدامِ تفریح تھا ورنہ حکومت کی گدیوں پر سے غداری ہو رہی تھی۔ بلیک مارکیٹ، ذخیرہ اندوزی اور اسمگلنگ کا زبردست دور دورا چل رہا تھا۔

صفیہ اور اس کا شوہر مشرف مفت میں بدمعاشوں کی نگاہ میں آچکے تھے اور ان کی لڑکی شمی کا تو عبید اغوا کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا تھا۔ وہ تو قسمت نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔

آخر ان لوگوں نے غریب صفیہ ہی کو کیوں تاکا تھا۔ اس میں دراصل صفیہ ہی کی تخصیص نہ تھی۔ ملک کا ہر جرائم پیشہ فرد اور پارٹی انواع و اقسام کے جرائم کا کامیابی سے ارتکاب کرنے کے بعد نشاط و راحت کے طور پر شہر یا باہر کی کسی بھی دیدہ زیب و معصوم عورت کو اڑا لاتے تھے۔

اس دفعہ صفیہ لپیٹ میں یوں آگئی تھی کہ اس کی حسین شکل اور گداز جسم کافی دنوں سے گنجے کی گندی نگاہ میں آیا ہوا تھا۔ کیونکہ وہ اسی محلہ کے قریب رہتا تھا۔ پہلے تو اس نے خود اپنے نفس ذلیل کے لئے صفیہ پر ہاتھ صاف کرنا چاہا تھا۔ پھر سوچا کہ اسے کریم کے لئے کیوں نہ اڑائے تاکہ روپیہ بھی ملے۔

دراصل اس میں بھی پٹی والے شخص اور گنجے کے درمیان ایک سازش تھی۔ وہ صفیہ کو اپنے مکان سے اڑانے کے بعد پہلے خود دونوں اس کے معصوم جسم پر خوت اڑانا چاہتے تھے۔ اس کے بعد اسے کریم کی نذر کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

آخر دوسرے روز گنجے نے پٹی والے شخص اور نفر دکو ساتھ لیا۔ پھر تینوں نے ایک بڑی ٹیکسی کرائے پر لی اور رور کا راستہ اختیار کیا۔ چند میل طے کرنے کے بعد ویرانہ آنے پر انہوں نے ٹیکسی والے

کو تو باندھ کر ایک نالے میں ڈال دیا اور پٹی والا مع اپنے دونوں ساتھیوں کے ٹیکسی کو لے اڑا۔

راہ میں پٹی والے نے دریافت کیا۔

نصرو! تیرے پاس کیا ہے؟

نصرو نے جواب دیا۔

چاقو ہے۔

پٹی والے نے پوچھا۔

میرے پاس بھی چاقو ہے۔ رزاق! تمہارے پاس تو پستول ہے نہ؟

گنجا بولا۔

ہاں! گھبراؤ نہیں۔

غرض گندی شہریت کے یہ تینوں افراد کیل کانٹے سے تیار ہو کر جرم کرنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔

شب کے ساڑھے دس بجے ہوں گے۔ آج کل چاندنی راتیں تھیں پھر ویسے بھی بجلی کی مصنوعی روشنی میں شہروں کے اندر چاندنی رات کا احساس تک نہیں ہوتا۔

صفیہ اور اس کا شوہر مشرف اپنے اپنے پلنگوں پر دراز باتیں کر

سہمے تھے۔

مشرف کبھی کبھی نیند میں ڈوب جاتا تو صفیہ اس کی گردن میں گدگدی کر کے اسے جگا دیتی۔

شمی اوپر کے کمرے میں پڑھنے میں مصروف تھی۔ چونکہ ساڑھے دس بج چکے تھے تو ویسے بھی آس پاس کے سب لوگ سو چکے تھے۔

سڑک پر بھی سناٹا تھا۔ کیونکہ یہ عام گذرگاہ نہ تھی۔

دور دور تک کسی سپاہی کا وجود نظر نہیں آرہا تھا۔ پولیس کا شاید یہ وطیرہ ہے کہ رات گئے جب جرائم پیشہ لوگ نکلتے ہیں تو پولیس ان کے لئے میدان خالی کر کے پسپا ہو جاتی ہے۔

آخر تھوڑی دیر بعد سڑک پر ایک کار آکر رکی اور پھر ایک دو منٹ بعد صفیہ نے اپنے دروازے پر دستک سنی۔

صفیہ نے مشرف کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

سو گئے کیا؟ دیکھئے! باہر کوئی دروازہ بجا رہا ہے۔

مشرف غنودگی میں بولا۔

سو جاؤ۔ اپنا دروازہ نہیں ہو گا۔

صفیہ نے کہا۔

میرا تو خیال ہے کہ اپنا ہی دروازہ کسی نے بجایا ہے۔

مشرف نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ایک منٹ بعد پھر دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔

صفیہ نے اپنے شوہر کو بیدار کرتے ہوئے کہا۔

اُٹھئے نہ دیکھئے۔ پھر کسی نے دستک دی ہے۔

آخر مشرف اٹھ بیٹھا اور غنودگی میں پلنگ کے نیچے پیر تل سے سلیپر ٹٹولنے لگا۔

لاحول ولاقوۃ، اس وقت کون آمرا۔

صفیہ نے اٹھ کر کہا۔

اچھا آپ آرام کیجئے۔ میں دیکھتی ہوں جا کر۔

مشرف بولا

ٹھہرو! میں جا کر دیکھتا ہوں۔

اور جمائیاں لیتا ہوا دروازے پر پہنچا۔ صفیہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔ ایک دفعہ صفیہ نے چاہا کہ اپنے شوہر کو ایک دم دروازہ کھول دینے سے منع کرے مگر مشرف چٹخنی کھول چکا تھا۔

مشرف نے دروازہ کھول کر باہر برآمدے میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

کون ہے بھئی؟

یہ تو ہم ہیں تمہارے پرانے دوست۔ کیا صفیہ اندر ہے۔ آسکتے ہیں ہم؟ گنجے نے کہا۔

اور اجازت کا انتظار کئے بغیر اندر چلا آیا۔ اس کے پیچھے پٹی والا شخص اور نصرو بھی آگئے۔

مشرف ایک تو ویسے ہی غنودگی میں تھا۔ پھر اس نے آج تک ان لوگوں کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ حیران تھا کہ یہ کون سا اس کے دوست ہیں۔

صفیہ بھی مشرف کے پیچھے ہی کھڑی تھی۔ اس نے بھی آج تک ان پاجیوں کو نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے اسے بھی حیرت تھی۔

مشرف نے ان تینوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

معاف کیجئے۔ میں نے آپ لوگوں کو پہنچانا نہیں۔ کیا آپ کو مجھ سے کوئی کام ہے؟

نصرو بولا۔

تم سے نہیں، تمہاری حسین بیوی سے۔

مشرف نے ان سے کہا۔

آپ لوگ غلط مکان میں آگئے ہیں۔ کسی دوسرے مکان میں جانا

ہو گا آپ کو۔

نہیں ہم اس عورت کے پاس آئے ہیں۔

گنجے نے اپنے بھاری اور مضبوط ہاتھ سے صفیہ کی نازک کلائی پکڑلی اور اسے اپنی طرف گھسیٹا۔

اب تو صفیہ کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی مگر لفرو نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

ارے! یہ کیا کرتے ہو تم لوگ۔ مشرف نے غصہ سے کہا اور گنجے کے منہ پر گھونسہ رسید کیا۔

مشرف نے گنجے کے ہاتھ سے اپنی بیوی کی کلائی چھڑالی اور پھر اسے مارنا چاہتا تھا کہ پٹی والے بدمعاش نے تیزی سے اس کی گردن پر چاقو کا ہاتھ مارا اور پیچھے سے لفرو نے بھی چھری رسید کی۔ مشرف کراہ کر زمین پر گر گیا۔

اس کے گرتے ہی گنجے نے صفیہ کو پکڑ کر اٹھا لیا اور تیزی سے اس کا منہ بند کر دیا۔ اس کے بعد سرعت تمام تینوں بدمعاش کار میں آگئے اور گاڑی کو ہوا کر دیا۔

کار پٹی والا شخص اڑا رہا تھا۔ گنجا اور نصرو صفیہ کو دابے بیٹھے تھے۔

صفیہ اس طوفانی بدتمیزی سے حیران تھی مگر اس نے ان بدمعاشوں کے ہاتھوں سے اپنے پیارے شوہر کو زخمی ہو کر گرتے دیکھا تھا۔ اس سے فوراً سمجھ گئی کہ وہ بدمعاشوں کے چنگل میں پھنس گئی ہے اور یہ لوگ اس کے شوہر کے قاتل ہیں۔

اس وقت صفیہ کے جذبات کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔

اس کا گھر لٹ گیا تھا۔ اس کے سر سے سہاگ کا تاج بے رحمی سے پھینک دیا گیا تھا۔

اور اس کی اکلوتی نوخیز لڑکی دنیا میں اکیلی رہ گئی تھی۔ ادھر تو ماں کی عصمت کی خیر نہ تھی۔ دوسری طرف شمی کی آبرو بھی محفوظ نہ تھی۔

خدا معطل نہیں ہے جسن اتفاقات عنقا نہیں ہو گئے ہیں مگر اپنے شوہر کے قتل کے بعد بد نصیب صفیہ کو کون سے حسن اتفاق کا انتظار رہ سکتا تھا۔

اب تو بدبختی کا دور دورہ تھا۔

مٹی کے گولے پر رینگنے والے یہ کیڑے مکوڑے جن کے سپرد انسانیت کی امانت کی گئی تھی۔ آج مہلک ترین ایٹمی ہتھیار تیار کر کے نہ صرف زمین ہی کو دھن ڈالنے کی فکر میں ہیں بلکہ خلاط بسیط میں پہنچ کر وہاں کی مخلوق کو بھی تاخت و تاراج کرنے کے درپے ہیں۔

اے ننگ انسانیت بشر! تیرا انجام کیا ہو گا؟

قانون لا قانون لوگوں کے لئے نہیں ہے۔ ان کے لئے تو فقط آہنی ڈنڈا ہے سخت ترین سزا ہے۔ صرف عذاب الیم ہی سے وہ کسی قدر سیدھے ہو سکتے ہیں۔

لوہے کو سخت تر لوہا ہی کاٹ سکتا ہے۔ لوہے اور رحم میں کوئی مناسبت نہیں۔

مخلوق خدا کے یہ تینوں گنہگار کاریں اڑتے ہوئے شہر سے جلد دور نکل

جانا چاہتے تھے۔ اسی وجہ سے بے اوسان ہو کر کار کو دوڑا رہے تھے مگر ایک دو میل طے کرنے بعد ہی ایک جیپ نے تاکا۔

چند منٹ بعد جیپ نے ان کا تعاقب کرنا شروع کیا۔

اسے پٹی والے شخص نے بھی محسوس کیا۔ کیونکہ کار وہی چلا رہا تھا۔ اس نے خطرے کی بو سونگھ کر کار کو اور تیز کر دیا۔ اودھر جیپ والے نے بھی اپنی جیپ کی رفتار تیز کر دی۔

گنجے نے عبدل کو قدرے سراسیمہ پا کر اڑتی ہوئی کار میں دریافت کیا۔

کیا بات ہے عبدل؟

عبدل نے جواب دیا۔

پچھلے شیشے میں سے دیکھ۔ وہ جیپ اپنا پیچھا کر رہی ہے۔

گنجے نے پچھلے شیشے میں سے دیکھا اور اسے بھی یقین ہونے لگا کہ جیپ تعاقب کر رہی ہے۔

گنجے نے کہا۔

عبدل! کار کو تیز نہ کر۔ شاید جیپ والا ہمیں اسمگلر سمجھ رہا ہے۔ معمولی رفتار سے گاڑی چلا تاکہ اس کا شبہ مٹ جائے۔

تیرا تو دماغ خراب ہے۔ اگر جیپ والا پاس آگیا تو میرے اور تیرے

کے شیشے کو توڑ کر نکل گئی۔

اب گنجے نے پے در پے دو فائر کئے تاکہ جیپ والا ڈر جائے اور قریب نہ آنے پائے۔

اس جیپ میں ڈی ایس پی جاوید ہی تھا۔ وہ باہر سے رات کا گشت لگا کر شہر میں آ رہا تھا کہ اس کی نظر اس کار پر پڑی تھی اور اپنی فراست کی بناء پر اسے شبہ ہوا تھا کہ یہ کار کوئی پُراسرار ہے۔ اس لئے بھانپنے کو اس نے ویسے ہی اس کار کے پیچھے اپنی جیپ لگا دی تھی۔

لیکن اب جاوید کا شبہ پختہ ہو گیا تھا۔ کیونکہ جیپ کو اپنے پیچھے پا کر کار تیز ہو گئی تھی اور اس میں سے فائر ہوتے دیکھ کر تو اسے یقین کامل ہو گیا تھا کہ اس میں ضرور اسمگلر ہیں۔

حالانکہ اس وقت یہ لوگ اسمگلر نہ تھے بلکہ دوسری قسم کے مجرم تھے اور کافی خطرناک۔

فائر سے جھجکنے کے بجائے بہادر جاوید پھر کار کے قریب آیا اور اس نے بھی فائر کیا مگر دونوں طرف سے تیز رفتاری کے باعث نشانے خطا جا رہے تھے۔

اس دفعہ قریب آنے پر گنجے نے سنبھل کر فائر کیا۔

اس فائر سے ایک بار جیپ کا اسٹرنگ بے قابو سا ہو گیا اور

جیب پیچھے رہ گئی۔

گنجے نے قہقہہ لگا کر کہا۔

مار دیا سالے کو۔ بڑا آیا تھا سورما بن کر میرے مقابلے کے لئے۔

پٹی والے شخص اور نصرو کے منہ سے نکلا۔

شاباش!

پستول کی یہ گولی جاوید کے پہلو پر لگی تھی۔

شکر ہے جسم میں داخل نہیں ہوئی تھی بلکہ گوشت چھیلتی ہوئی نکل گئی تھی۔ بہر حال جاوید زخمی ہو گیا تھا۔

مگر اس جواں مرد نے اپنی جان کی پرواہ نہیں کی۔ جلد سنبھل کر پھر کار کا تعاقب شروع کر دیا اور اس دفعہ بہت تیزی سے قریب آ گیا۔

اسے پھر قریب پا کر گنجے نے ایک فائر کیا۔ اس فائر کے ایک ہی لمحہ بعد جاوید نے بھی تاک کر فائر کیا۔ یہ گولی پٹی والے شخص کے سر پر لگی اور بھیجے کے پار ہو گئی۔ پٹی والا شخص آواز نکالے بغیر اپنی سیٹ پر تڑپا اور ٹھنڈا ہو گیا۔

چونکہ کار پٹی والا شخص چلا رہا تھا۔ اس لئے اس کے گولی لگتے ہی گاڑی بے قابو ہو گئی مگر گنجے نے لپک کر پٹی والے شخص کی لاش پر

سے اسٹرنگ کو سنبھالا۔

مگر جاوید نے گنجے کو بھی نہیں سنبھلنے دیا۔ پھر فائر کیا۔ یہ گولی گنجے کے بازو پر پڑی اور ہڈی توڑتی ہوئی نکل گئی۔

اب کار کا قابو میں رہنا مشکل تھا۔ وہ مست یا پاگل جانور کی طرح ادھر اُدھر دوڑی اور ریت کے ایک بہت بڑے تودے پر چڑھ کر ریت میں جا پھنسی۔ اس کے بعد انجن گھڑ گھڑا کر بند ہو گیا۔ بہرحال ٹوٹنے سے بال بال بچی۔

کار کے رُکتے ہی نصرو سب کو چھوڑ چھاڑ کر اپنی جان بچانے کو جلدی سے کودا اور نشیب میں لڑھک کر تاریکی میں غائب ہو گیا۔

جاوید نے اس کے سائے پر گولی چلائی مگر وہ بچ نکلا۔

اب جاوید نے اپنی جیپ روکی اور اطمینان سے اُترا۔ اس کے بائیں پہلو سے خون ٹپک رہا تھا۔ ادھر کار کے اندر دونوں سیٹیں خون سے تربتر ہو رہی تھیں۔ ایک پر پٹی والے کی لاش لہولہان پڑی ہوئی تھی اور دوسری پر گنجا اپنے ٹوٹے ہوئے خون آلود ہاتھ کو پکڑے بیٹھا تھا۔ صفیہ کی شاید خوف وہراس سے آواز نہیں نکلی تھی۔

گنجے نے کہا۔

شاباش جاوید صاحب۔ واقعی آپ بڑے بہادر ہیں۔

جاوید پستول تانے ہوئے کار کے قریب آگیا تھا۔
جاوید نے ڈانٹ کر کہا۔
کون ہے بے تو باہر نکل۔
گنجے نے کہا۔
نکلوں کیسے ؟ آپ نے تو میرا ہاتھ توڑ ڈالا اور میرے ساتھی کو مار ڈالا۔
جاوید نے تحکمانہ دریافت کیا۔
باہر نکل۔ کیا مال لے کر بھاگ رہے تھے تم لوگ ؟
گنجے نے باوجود زخمی ہونے کے مذاق کے موڈ میں کہا۔
مال تو ہمارے پاس کچھ نہیں ہے صاحب۔ پر ایک قیمتی جاندار قیمتی چیز ہے جو آپ جیسے خوبصورت افسر کو بھی بہت پسند آئے گی۔
جاوید نے اس کی بکواس پر توجہ نہیں کی۔ بڑھ کر جلدی سے کار کا پچھلا دروازہ کھولا تو اپنی جیپ کی روشنی کے انعکاس میں اسے پچھلی سیٹ پر ایک عورت پڑی ہوئی نظر آئی جو اسے دیکھ کر چیخ پڑی۔
نعمیہ نے چیخ کر کہا۔

مجھے بچائیے۔ آہ! ان ظالموں نے میرے شوہر کو مار ڈالا۔
جاوید نے اس سے پوچھا۔
کون ہیں آپ؟
اس کی آنکھوں کے سامنے خوبصورت اور شریفانہ لباس میں ایک
دہشت زدہ و پریشان حال عورت تھی۔
صفیہ فرط رنج وغم سے کچھ نہ بول سکی۔
جاوید نے گنجے سے پوچھا۔
کتنے آدمی تھے تم؟
گنجے نے اسے رشوت کا لالچ دیتے ہوئے کہا۔
تین۔ ایک بھاگ گیا۔ دوسرا یہ مرا پڑا ہے۔ تیسرا یہ حاضر ہے۔
جاوید صاحب! اگر آپ مجھے چھوڑ دیں گے تو میں ابھی ابھی آپ کو اتنا
روپیہ دلا سکتا ہوں کہ آپ کی پشتہا پشت تک ختم نہ ہوگا۔
جاوید نے کہا۔
وہ تیرے دیئے بغیر بھی ہمارے قبضہ میں آجائے گا۔ وہ سب
حکومت کا پیسہ ہے۔
گنجے نے کہا۔
شش حکومت۔ آپ کو کیا خبر کہ حکومت کو ہم نے خرید رکھا ہے۔

جاوید نے سختی سے کہا۔

زبان بند کرو ورنہ تالو سے کھینچ لوں گا۔ چل جیپ میں بیٹھ طفل کر۔

مگر اس نے گنجے کو دھکا نہیں دیا کیونکہ گنجا زخمی ہو رہا تھا۔

گنجے نے کہا۔

جاوید صاحب! روانہ ہونے سے پہلے ہمیں آپ ہی کا ڈر تھا۔

آخر آپ سے مڈبھیڑ ہو کر رہی۔

جاوید بولا۔

کاش! کمبختو تمہیں خدا کا ڈر ہوتا۔

اور پھر صفیہ کی طرف متوجہ ہوا۔

جاوید نے صفیہ سے دریافت کیا۔
آپ زخمی تو نہیں ہوئیں؟
اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی خوبصورت آنکھوں سے اشک رواں تھے۔
ارے ظالمو! کیا تم نے اس خاتون کی عزت بھی لوٹ لی ہے۔ جاوید نے گنجے سے کہا۔
صفیہ کے اندوہ غم سے اسے یہی شبہ ہوا۔
گنجے نے کہا۔

نہیں جاوید صاحب! یہ ہمارے لئے نہیں تھی۔ اسے ہم دوسرے کے لئے لے جا رہے تھے۔ آپ خود ان سے دریافت کر لیجئے۔

ایسا شرمناک سوال جاوید نے مناسب نہ سمجھا۔ وہ اسے ایک معزز عورت نظر آ رہی تھی۔

جاوید کو صفیہ سے اتنا تو دریافت کرنا پڑا۔

کیا یہ شخص سچ کہتا ہے؟

صفیہ نے انتہائی تشویش سے کہا۔

جی ہاں۔ اچھا اب خدا کے واسطے مجھے جلد میرے مکان پر لے چلئے۔ خدا کرے میں اپنے شوہر کو زندہ پاؤں۔

جاوید نے اپنی گاڑی میں سے رسی نکالی۔ پھر اس سے گنجے کی دونوں ٹانگیں اور سالم ہاتھ کس کر باندھ دیا اور اسے جیپ میں ڈال دیا۔ اسی طرح پٹی والے شخص کی لاش کو گھسیٹ کر جیپ میں لا ڈالا اور صفیہ کو آگے والی پر اپنے برابر بٹھا لیا۔

راہ میں جاوید نے حادثہ کے متعلق صفیہ سے چند سوالات کئے اور جستہ جستہ واردات کی کیفیت دریافت کی۔ اسی طرح گنجے سے بھی اس نے سرِ دست چند سوالات کرنے پر اکتفا کی۔

جاوید نے گنجے سے دریافت کیا۔

یہ کار کس کی تھی؟

گنجے نے جواب دیا۔

چوری کی تھی سرکار۔

تم لوگوں نے چرائی ہو گی یہ؟

گنجے نے پٹی والے شخص کے متعلق کہا۔

نہیں اس مردوے نے۔

جاوید نے اس بار صفیہ سے دریافت کیا۔

اس شہر میں آپ کے یا آپ کے شوہر کے والدین اور عزیزو اقارب تو ہوں گے؟

صفیہ نے کہا۔

جی نہیں۔ ہم دونوں میاں بیوی تقریباً اکیلے ہیں۔ ہماری طرف ایک ہی بچی ہے۔ خدا جانے فرطِ غم سے میری ممّی کا کیا حال ہوا ہوگا۔ گھر پر اس کے سوا کوئی نہیں۔ نوکر وغیرہ بھی جا چکے تھے۔

ایک طویل ابتلا کے بعد جو اسے سکون نصیب ہوا تو اس کے حواس بجا ہونے لگے۔ حالانکہ مکان پر پہنچنے کے بعد غم و اندوہ اس کا انتظار کر رہے تھے۔

جاوید نے کہا۔

خدا پر بھروسہ رکھئے اور دل مضبوط کیجئے۔

صفیہ نے دعا کی۔

مشرف کو ان موذیوں نے بہت بری طرح زخمی کر دیا تھا۔

خدایا! ان کی جان بچا لے۔

جاوید نے پوچھا۔

کیا ان تینوں بدمعاشوں نے مل کر انہیں زخمی کیا تھا؟

صفیہ نے کہا۔

دو نے اُن پر حملہ کیا تھا۔ ایک تو یہ موذی آپ کے ہاتھ سے شکر ہے جہنم داصل ہوا۔ دوسرا بھاگ گیا۔

صفیہ نے جاوید کی خون سے تر بتر وردی کو دیکھ کر کہا۔

اوہو! آپ کے بھی تو خون بہہ رہا ہے۔

جاوید بولا۔

کچھ نہیں۔ معمولی سی خراش ہے۔

گنجا پیچھے سے بولا۔

حضور! آپ پر میں نے گولی نہیں چلائی تھی۔

صفیہ نے گنجے کی تردید کرتے ہوئے کہا۔

یہ جھوٹا ہے۔ تمام فائر آپ پر اسی شقی نے کئے تھے۔

جاوید نے مختصراً کہا۔

مجھے معلوم ہے۔

تمام راہ جاوید اس واردات پر غور کرتا رہا۔ بچاہُوا تو اپنی اور اپنی پارٹی کی حقیقت ظاہر ہی کیبل کرنے لگا تھا۔ جو کچھ واقعہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ صفیہ کی زبانی ہی ظاہر ہو سکتا تھا۔

مگر جاوید فقط اس واقعہ کے متعلق معلومات بہم پہنچانے کی فکر میں نہ تھا بلکہ اصل چیز یہ تھی کہ اس تمام واردات کی غرض و غایت کیا ہو سکتی تھی۔

عورت کا اغوا کیوں کیا گیا تھا۔ یہ ڈکیتی کا کیس نہ تھا۔ کیونکہ صفیہ کے مکان سے بدمعاش کوئی مال لے کر فرار نہیں ہوئے تھے۔ انہوں نے تو صرف صفیہ کے اغوا پر اکتفا کی تھی۔

لیکن کیوں ؟ محض اغوا ہی پر اکتفا کیوں کی گئی۔ بدمعاشوں کی نیت صفیہ کے شوہر کو بھی قتل کرنے کی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ وہ سدِ راہ ہوا ہو گا۔ اپنی اہلیہ کی مدافعت وحفاظت کے لئے بڑھا ہو گا۔ اگر اس کی جگہ صفیہ کے اغوا میں کوئی دوسرا شخص ان بدمعاشوں کا مزاحم ہوتا تو اسے بھی وہ اسی طرح زخمی کر کے صفیہ کو لے اڑتے۔

جاوید نے سوچا۔

بہر حال یہ اسرار فی الحال جاوید کی سمجھ میں نہیں آرہے تھے خیر ایک وہ روز بعد اس معمہ کی کوئی کڑی صفیہ ہی کے ذریعہ ہاتھ آسکے گی۔

صفیہ کی رہبری پر جاوید پہلے اس کے مکان ہی پر پہنچا۔ اتنا بڑا حادثہ ہوا تھا۔ اس لیے محلہ بلکہ غیر جگہ تک کے لوگ صفیہ کے مکان پر جمع ہو گئے تھے۔

اس تمام حادثہ پر بمشکل آدھا گھنٹہ گزرا ہوگا۔ پولیس بھی آچکی تھی۔ اور جاوید کی جیپ کو دیکھ کر مجمع کو ہٹانے لگی تھی۔

سب انسپکٹر نے آگے بڑھ کر سلوٹ کرتے ہوئے کہا۔

پکڑ لائے جناب ملزموں کو؟

جاوید نے سب انسپکٹر سے کہا۔

ایک بھاگ گیا۔ ایک میرے ہاتھ سے مارا گیا۔ تیسرا یہ زخمی موجود ہے۔ اسے پولیس کی گاڑی میں ڈال کر شفاخانہ پہنچا دیجئے۔

دوسرے سب انسپکٹر نے کہا۔

آپ بھی تو زخمی معلوم ہوتے ہیں؟

جاوید نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جیپ سے اتر کر صفیہ کے مکان میں داخل ہوا۔

اپنا مکان آتے ہی صفیہ جیپ سے کود کر اپنے شوہر کی کیفیت دیکھنے
بیتابانہ مکان کے اندر آ گئی تھی۔ کمرے میں اندر برآمدے تک اپنے
شوہر کا خون ہی خون دیکھ کر اس کا کلیجہ منہ کو آ گیا اور وہ دھاڑیں
مارنے لگی۔

محلہ کے ایک شخص نے صفیہ کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔

گھبرایئے نہیں۔ آپ کے شوہر زندہ ہیں۔ انہیں شفاخانے
پہنچا دیا گیا ہے اور انہی کے ساتھ آپ کی لڑکی بھی اسپتال چلی
گئی ہے۔

صفیہ نے بیتابانہ کہا۔

مجھے بھی لے چلو شفاخانہ۔ خدارا اسی وقت لے چلو۔

جاوید نے اس کے بازو کو سہارا دیتے ہوئے کہا۔

آیئے! میں وہیں جا رہا ہوں۔ دیکھئے! آپ کا وعدہ تھا کہ دل
مضبوط رکھیں گی۔

اور اسے جیپ میں لا بٹھایا۔ اس کے بعد سب انسپکٹر سے
بولا۔

مجمع کو ہٹا دیجئے۔ مکان پر چار کانسٹیبل پہرہ دیں گے۔ آپ
اسی وقت ایک کانسٹیبل کو ساتھ لے کر ملزموں کی کار کے پاس

چلے جائیے اور اس نے اس مقام کا پتہ بتا دیا جہاں کار پڑی ہوئی تھی۔

مشرف کے کاری زخم آئے تھے۔ اس کے جسم میں خون پہنچانے کی تدبیریں کی جا رہی تھیں لیکن ڈاکٹروں کی شکل سے ہی ہویدا تھا کہ زخمی کے جانبر ہونے کی انہیں امید نہیں۔

وہ قطعی بیہوش تھا۔

چونکہ مشرف کو آپریشن کے کمرے میں لے جایا جا چکا تھا۔ اس لیئے صفیہ اس تک نہیں پہنچ سکی۔ بہادر کشتی اپنے باپ کی یہ زبوں حالی اور کلیجہ شق کرنے والی حالت کو دیکھ کر بڑے ضبط سے کام لے رہی تھی۔ ادھر اس کی ننھی سی جان کو ماں کے اغوا کا شدید غم اپنا جلا ہوا تھا۔

مگر جیسے ہی اپنی والدہ کو اترتا دیکھ کر بے تحاشہ دوڑی اور اس سے لپٹ گئی۔

سسکیوں کے درمیان کشتی کے منہ سے نکلا۔

میری امّی! آپ آگئیں۔ اللہ تیرا شکر ہے۔

جاوید نے پاس آ کر کہا۔

پیاری اور بہادر بیٹیاں رویا نہیں کرتیں۔ آپ بھی اپنی بچی کو دھارس

بندھائیے۔ آئیے! اس کمرے میں آجائیے اور انہیں کمرے میں لے گیا۔

اس وقت جاوید ایک فرض شناس پولیس آفیسر بھی تھا اور ایک شہری بھی۔ اس نے ہر طرح ان دونوں اذیت رسیدہ و محتاجِ تسکین ہستیوں کی ہمت بندھائی۔ دلاسا دیا اور اصرار کر کے چائے پلائی۔

جاوید نے انہیں حوصلہ دلاتے ہوئے کہا۔

آپ خود سمجھدار ہیں۔ خدا پر بھروسہ رکھئے۔ موت و زیست اسی کے قبضہ میں ہے۔ ہمت سے کام لیجئے۔ مشرف صاحب کی زندگی کے لئے ڈاکٹر کسی تدبیر سے دریغ نہیں کریں گے۔ بس وہ اتنا ہی کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد آپ کی ہمت و حوصلہ کا امتحان ہے۔ یہاں آرام سے بیٹھئے۔ میں آپ کے پاس آتا رہوں گا۔

اور باہر آگیا۔

ڈاکٹروں سے اسے پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا کہ زخمی شاید ہی صبح پکڑ سکے گا۔ اس صورت میں صفیہ اور اس کی لڑکی کا تمام رات شفاخانہ میں رہنا بے سود تھا۔ چنانچہ گھنٹے آدھ گھنٹے بعد جاوید پھر صفیہ کے پاس آیا۔

صفیہ نے دلیری ہی پر بیتابانہ سوال کیا۔

کیا حال ہے جاوید صاحب اب ان کا؟
جاوید نے کہا۔
سانس سے آس ہے۔ آپ صرف اللہ پر نگاہ رکھئے۔ آیئے
اب میں آپ کو مکان پر پہنچا آؤں۔
دونوں ماں بیٹی نے اشک بہاتے ہوئے دریافت کیا۔
خدارا اتنا تو بتا دیجئے کہ وہ بچ تو جائیں گے نہ؟
جاوید نے رشمی سے کہا۔
میں ابھی عرض کر چکا نہ کہ ڈاکٹر ہر ممکن تدبیر کر رہے ہیں۔
چلئے۔ چلو بیٹی تم بھی اب مکان پر جا کر آرام کرو۔
جاوید بھی اپنے زخم پر پٹی بندھوا کر اور کپڑے تبدیل کر کے آ گیا تھا۔ ابھی اسے پورے واقعہ کی تفتیش کرنا تھی۔ اس لئے چاہتا تھا کہ صفیہ اور رشمی کو ان کے مکان پر پہنچا کر فارغ ہو جائے۔
صفیہ نے دریافت کیا۔
کیا یہ ممکن نہیں کہ میں مشرف کو دیکھ لوں؟
جاوید نے جواب دیا۔
وہ آپریشن کے کمرے میں ہیں۔ وہاں کسی کو جانے کی اجازت نہیں۔ میں بھی نہیں جا سکتا ہوں۔

صفیہ نے کہا۔

مجھے مکان پر وحشت ہوگی۔ اس سے تو بہتر ہے کہ یہیں رہوں۔

جاوید نے کہا۔

آپ مکان پر چلیں۔ میں اپنی والدہ صاحبہ کو آپ کے پاس بھیج دوں گا۔ ان سے آپ کو بڑی تسکین رہے گی۔

اور یہ اس نے انسانی ہمدردی کا دوسرا ثبوت دیا۔

غرض تھوڑی دیر بعد جاوید نے صفیہ وشتی کو جیپ میں سوار کیا اور ان کے مکان پر روانہ ہوا۔ ادھر اس نے ایک سپاہی کو اپنے مکان پر روانہ کیا تاکہ اس کی والدہ کو گاڑی میں بٹھا کر صفیہ کے گھر پر لے آئے۔

راہ میں جاوید افسوس سے سوچتا ہوا جا رہا تھا کہ صبح تک بدنصیب صفیہ کو اپنے شوہر کے انتقال کی اطلاع مل جائے گی۔ خدا کرے، وہ اس صدمۂ عظیم کو برداشت کر جائے۔

ڈاکٹروں کی تمام تدابیر رائیگاں گئیں۔ مشرف صبح بھی نہ پکڑ سکا۔ شب کو تین بجے تک اس کا انتقال ہو گیا اور وہ ستانے والی اس دنیا میں اپنی بیوی اور بچی کو بے یار و مددگار چھوڑ گیا۔

صفیہ مکان پر آ کر تمام رات نہ سو سکی۔ ہر آہٹ پر اس کے کان لگے ہوئے تھے کہ اب مشرف کی حالت کے متعلق کوئی اطلاع آئے۔

تھوڑی دیر تک شمی بھی جاگی۔ آخر اسے جاوید کی والدہ نے پیار چمکار کر سلا دیا۔

آخر جاوید کی ماں نے صفیہ سے کہا۔

بیٹی! ایں غیر سہی لیکن مجھ سے یہ تمہاری بے چینی نہیں دیکھی جاتی کیا تمام رات آنکھوں میں کاٹو گی۔ ذرا تم بھی آرام کر لو اور اللہ پر بھروسا کر رہو۔

صفیہ نے کہا۔

آپ سو جائیے اماں۔ مجھے بیحد شرمندگی ہے کہ میری وجہ سے پہلے جاوید صاحب اور اب آپ کو اس قدر تکلیف اٹھانی پڑی۔

جاوید کی والدہ نے کہا۔

میں تو رات کو ویسے بھی کم سوتی ہوں۔ کوئی خیال نہ کرو۔ جاوید نے اپنا فرض ہی تو ادا کیا ہے۔ بے آرام ہونے سے کیا فائدہ تمہارے شوہر کو خدا جلد اچھا کر دے گا۔ پریشان نہ ہو۔

آخر ان کے اصرار بلیغ پر صفیہ دراز ہو گئی اور اچاٹ نیند نکالنے لگی۔

جاوید نے صبح کے آٹھ بجے تک صفیہ کے پاس اس کے شوہر کی خبر مرگ نہیں روانہ کی۔ اس میں یہ مصلحت تھی کہ وہ اطمینان سے ناشتہ وغیرہ کر لے۔

مگر صفیہ علی الصبح ہی بیدار ہو گئی اور دروازے پر جا کر کھڑی ہو گئی۔ جب ساڑھے سات بج گئے تو اسے خیال آیا کہ اپنی پریشانی

میں وہ ہمدرد جاوید کی محبت کرنے والی ماں کو بھی بھولی جا رہی ہے۔ اس کے لیئے ناشتہ کا انتظام کرنا چاہیئے۔

چنانچہ دونوں ماں بیٹی جلد جلد ناشتہ تیار کرنے میں مصروف ہو گئیں۔ اس میں جاوید کی ماں نے بھی ان کا ہاتھ بٹایا۔ آٹھ بجے تک ماما بھی آگئی۔ سب نے مل کر ناشتہ کیا۔

صفیہ ناشتہ کے بعد بولی۔

کیا بات ہے۔ شفاخانہ سے اب تک مشرمن کی کوئی خیر و خبر نہیں آئی۔

جاوید کی والدہ نے کہا۔

وہ شفاخانہ ہے آخر بیٹی۔ نامعلوم کتنے شدید کیس ایسے ہی وہاں اور بھی موجود ہوں گے۔ جاوید اپنے کاموں میں پھنس گیا ہو گا۔ اسی سبب سے وہ بھی نہیں آیا۔

صفیہ خاموش ہو گئی۔ شاید اندر والے نے اس سے کہہ دیا تھا کہ خیریت نہیں ہے۔ بعض باتوں کی علامات وقت سے پہلے ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ صفیہ بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہی تھی۔

آخر ساڑھے آٹھ بجے باہر کسی نے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ صفیہ نے محسوس کیا جیسے باہر کوئی کہہ رہا ہو کہ وہ چل بسا۔

آخر یہی ہوا۔ جاوید کے روانہ کئے ہوئے سپاہی نے آکر نہایت افسوس سے اطلاع دی کہ مشرف صفیہ کو بیوہ کر گیا اور اس کی میت مکان پر آ رہی ہے۔

اب یہ لکھنا بیکار ہے کہ اس صدمہ جانکاہ سے صفیہ دکھی پر کیا گزری۔ بس زمانہ ان کی نگاہ میں تیرہ و تار ہو گیا اور حسین صفیہ پر رنڈاپا اور اس کی بالی عمر پر بیٹھی قابض ہو گئی۔

تین روز تک جاوید کی والدہ یہیں رہیں اور اس خدا ترس بڑھیا نے ہر طرح ماں بیٹی کو ڈھارس بندھانے کی کوشش کی مگر اذیت رسیدہ دلوں کو جلد صبر نہیں آیا کرتا۔

آخر تین روز بعد جاوید کی والدہ ہر طرح صفیہ کو صبر کی تلقین کر کے روانہ ہو گئیں۔ غرض صفیہ مبتلائے عذاب ہو گئی یعنی عدت کے دن گزارنے لگی۔ انسان کی چھوٹی سی زندگی کس قدر واقعات کے تابع ہے اور یہ واقعات آسمان سے نہیں ٹپکتے بلکہ ایک انسان ہی دوسرے انسان کے لئے انہیں پیدا کرتا ہے۔

بے خطر راہ وہی ہے جس میں ہمارے قدموں سے دوسروں کے مفاد پامال نہ ہوں مگر ہم میں سے ہر شخص وہی راستہ اختیار کر لیتا ہے جس میں دوسروں کے حقوق کچلے جائیں اور اپنا مفاد پیدا ہو

چڑھے۔

مہذب مغرب اور سائنس کے کعبہ کا آدمی یہی کر رہا ہے۔ وہ اپنی بقا کے لئے تمام دنیا کو ایٹمی ہتھیاروں سے تباہ کر دینا چاہتا ہے۔ اس کے لئے یہ سب کچھ مباح ہے کیونکہ وہ مہذب ہے۔

جن ملکوں کے انسانوں کے حصہ میں جہل و پسماندگی آئی ہے وہ دوسرے طریقوں سے ایک دوسرے کو کھائے جا رہے ہیں لیکن یہودیت یہاں بھی موجود ہے۔ اس کی تخصیص کچھ مغرب اور روس کے ساتھ نہیں۔ خود انتفاعی کا دور دورہ ان ملکوں میں بھی ہے۔

ہر شخص فرض سے ہٹ گیا ہے۔ جب خدا کا حق ادا کرنا ہم بھول جاتے ہیں تو فرائض سے بھی نا آشنا ہو جاتے ہیں۔ اگر سماج دشمن خان بہادر کریم اپنے نفس ذلیل میں اس روز ایک ناروا تڑپ محسوس کر کے اس کا اظہار گنجے، پٹی والے شخص، نصرو اور اسی قماش کے دوسرے ساتھیوں سے نہ کرتا تو ادھر نہ تو مشرف کی جان جاتی نہ ایک شریف گھرانا تباہ ہوتا اور نہ صفیہ کی زندگی اپنے خوشگوار حال سے ٹوٹ کر ایک غیر یقینی مگر شدید مستقبل میں جھولنے لگتی۔

مشرف کوئی دولت مند شخص نہ تھا۔ بس کھاتا پیتا آدمی تھا۔ اتنا

کما لیتا تھا کہ گھر کی زندگی خوش و خرم گزر رہی تھی ورنہ اس نے پس ماندگان کے لئے کوئی جاگیر و جائداد نہ چھوڑی تھی۔

ایک دو ماہ بعد جاوید اپنی اس نمایاں کارکردگی کی بناء پر سپرنٹنڈنٹ کے عہدہ کے لئے نامزد کر دیا گیا۔ اس کے بالا افسر نے اس کی سفارش کی تھی اور امید ہوتی تھی کہ یہ سفارش رائیگاں نہیں جائیگی۔ کیونکہ ہر طرح ترقی کا مستحق تھا۔

جاوید کو بھی اس کی مسرت تھی کہ ترقی کے لئے اس کی سفارش کی گئی ہے لیکن ترقی ہو یا نہ ہو۔ جاوید اس قسم کا انسان تھا کہ اجر و صلہ سے بے نیاز ہو کر اپنا فرض ادا کرنے میں لگا رہتا تھا۔

ملک کو ایسے ہی افراد کی ضرورت تھی مگر وطن کے حکمران و سیاسی بازی گروں نے پوری قوم کی ذہنیت کو مسخ کر ڈالا تھا۔ جو کسر رہ گئی تھی، اسے ملک کے بڑے تاجروں اور اجارہ داروں نے پورا کر دیا تھا۔ مخلص و فرض شناس انسان ملک میں ڈھونڈنے سے نہیں ملتا تھا۔

ایک روز فرید نے جاوید کے مکان پر آکر دریافت کیا۔

ماموں! میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ بیچاری شمی کے والد کو چند آدمیوں نے قتل کر دیا اور قاتلوں کو آپ نے گرفتار کیا ہے۔

جاوید قریبی رشتہ میں فرید کا ماموں ہوتا تھا۔
فرید کبھی کبھار اپنے ماموں سے ملنے آجایا کرتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جاوید اپنے فرائض کے سلسلے میں بیشتر مکان سے باہر رہتا تھا۔ پھر فرید کس سے ملنے جاتا۔ ہاں جاوید کی والدہ (جو رشتہ میں فرید کی نانی ہوتی تھی) فرید کو بہت چاہتی تھیں۔
جاوید نے مسکرا کر دریافت کیا۔
ہاں یہ صحیح ہے مگر تم ستی سے کس طرح واقف ہو فرید؟
فرید نے جواب دیا۔
میں تو اس کی والدہ صفیہ صاحبہ کو بھی جانتا ہوں۔
جاوید نے قدرے تعجب سے پوچھا۔
اچھا! لیکن کس طرح؟
فرید نے کہا۔
عابد کے ذریعہ۔
اس نے نمائش کے واقعہ سے لے کر صفیہ کے مکان پر اپنے ایک دو بار جانے کا مختصر حال جاوید کو سنایا۔
جاوید نے دریافت کیا۔
یہ عابد وہی تو غنڈہ لڑکا نہیں جس نے چند ماہ ہوئے ایک لڑکی

کا اغوا کرنا چاہا تھا مگر پکڑا گیا۔ پھر بعد میں اپنے والد کے اثر سے بچ گیا؟

فرید بولا۔

جی ہاں وہی۔

جاوید نے کسی سلسلہ کو ٹٹولنے کی کوشش میں فرید سے سوالات کرنے شروع کئے۔

کیا عبید کسی صاحب اثر بڑے آدمی کا بیٹا ہے؟

فرید جو کچھ عبید اور اس کے والد کے متعلق جانتا تھا، جاوید کو بتاتا ہوا بولا۔

اس کے والد کا نام خان بہادر کریم الدین ہے۔ یہ مجھے معلوم نہیں کہ وہ صاحب اثر انسان ہے۔ اتنا جانتا ہوں کہ اس کا بڑا کاروبار ہے اور وہ دولت مند آدمی ہے۔

جاوید نے کہا۔

خوب! خان بہادر کریم الدین کا نام میں نے بھی سنا ہے اور میں اسے اچھا آدمی نہیں سمجھتا۔

فرید نے جاوید کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

اچھا ماموں! شاید آپ کو یہ معلوم نہ ہوگا کہ عبید نے جس لڑکی کا

اغوا کرنا چاہا تھا، وہ شمی ہی تھی۔

جاوید نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا۔

واقعی سخت تعجب کی بات ہے۔

کاش! اسے کسی طرح معلوم ہو جاتا کہ جس لڑکی کو عبید نے اغوا کرنا چاہا تھا، اسی کی ماں کو عبید کے باپ کے لئے تاکا گیا تھا۔ اسی کے لئے صفیہ کو اڑایا گیا تھا، اس کے شوہر کو قتل کیا گیا تھا اور اصل قاتل عبید کا باپ ہی تھا جس کے ایما و منشا سے صفیہ کی زندگی خراب کی گئی تھی۔

کاش مستعد کار و فرض شناس پولیس افسروں کو کوئی ایسی قوت حاصل ہوتی جس کے ذریعہ وہ ہونے والے جرم کا حال اور جرائم آشنا ذہنیت رکھنے والے افراد و جماعت کی نیت قبل از وقت پڑھ سکتے۔ ایسی قوت موجود تو ہے۔ یہ قوت عوام کا تعاون ہے۔

جاوید کی والدہ نے فرید کو چائے پلاتے ہوئے پوچھا۔

فرید بیٹے! یہ تو نے اپنا حلیہ کیا بنا لیا ہے؟

فرید بولا۔

کیا ہوا نانی اماں؟

جاوید کی والدہ نے کہا۔

ماشاء اللہ اب تو جوان ہو گیا مگر تجھے نہ کھانے کا شوق ہے نہ پہننے کا۔ جوان لڑکے کیا ایسا سادہ لباس پہنا کرتے ہیں جیسا تو نے پہنا ہوا ہے۔

فرید مسکرانے لگا۔

فرید نے کہا۔

نانی اماں! یہ اپنے ہی ملک کا بنا ہوا کپڑا ہے۔ ہم غیر ملک کا کپڑا کیوں استعمال کریں۔ مجھے تو اس پر بھی غصہ آتا ہے کہ عورتیں غیر ملکوں کے کپڑوں پر جان دیتی ہیں اور اپنے ملک کی چیزیں استعمال کرنا کم حیثیتی و کسرِ شان سمجھتی ہیں۔

جاوید نے کہا۔

فرید میاں! مجھے تمہارے خیالات سے بڑی خوشی ہوئی۔ اچھا اس وقت تو میں باہر جا رہا ہوں۔ کل میرے پاس ضرور آنا۔ تم سے چند باتیں دریافت کرنا ہے۔

وہ چلا گیا۔ فرید اپنی نانی سے باتیں کرتا رہا۔

حاجی موسیٰ نے ایک چھوٹے تاجر سے کہا۔

سب سے بڑا ایمان دار، عزت والا اور بڑا آدمی وہ ہے جس کے پاس پیسہ ہے۔

تاجر نے تائید کرتے ہوئے کہا۔

اس میں کیا شک ہے سیٹھ۔ سب سے بڑی محبت پیسے کی۔ کیسا وطن اور کہاں کی قوم۔

حاجی موسیٰ نے کہا۔

تجارت میں جب تک ایک کے دس نہ ہوں تو وہ تجارت

نہیں مکھیاں مارنا ہے۔ بعض لوگ ہم سے کہتے ہیں کہ بابا ایک روپیہ پر تین یا چار آنے نفع لو۔ پورے چار یا پانچ کیوں لیتے ہو ایک روپے پر۔ اب ایسے احمقوں سے کون کہے کہ تمہارے باپ دادا نے بھی کبھی تجارت کی تھی۔

ایک تاجر بولا۔

بیوپار میں دل ہی جب لگتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ منافع کمایا جائے ورنہ چھوٹے فائدے کے لئے کاروبار کرنا تو ایسا ہے جیسے پلا بچا کر کسی سے بھیک مانگنا۔

سیٹھ موسیٰ نے ایک دکاندار سے کہا۔

احمد! میں اپنے لائسنس کے چالیس ہزار سے کم نہیں لوں گا۔

احمد نے کہا۔

حاجی صاحب! پانچ ہزار کے مال والے لائسنس کے چالیس ہزار تو بہت زیادہ ہیں۔

پھر بولا۔

اس کے علاوہ اکثر مال خراب بھی نکل جاتا ہے۔

حاجی موسیٰ نے کہا۔

خراب مال کو اچھے مال میں ملا کر بیچا کرو۔
یہ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔
حاجی موسیٰ نے کہا۔
میں نے دس پیٹیاں پچاس ہزار میں کل ہی فروخت کی
ہیں۔
احمد نے پوچھا۔
کتنے کی؟
حاجی موسیٰ نے کہا۔
چھ سات ہزار روپے سے زیادہ کی نہیں ہوں گی پیٹی کھولنے
کے بعد جگو میرے پاس آیا کہ دو پیٹی کا مال خراب نکلا ہے میں
ہنسا اور بولا کہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ تم اسے کسی اور کے سر مار
دو۔
احمد نے کہا۔
کیا بات ہے حاجی صاحب! آج چائے نہیں پلائی۔
حاجی موسیٰ نے جواب دیا۔
رمضان کے دن ہیں۔ میرا بھی روزہ ہے۔
اور تلاوت کے لئے قرآن کھول کر بیٹھ گیا۔

احمد نے کہا۔

اچھا تو حاجی صاحب ! لائسنس کے بیس ہزار روپے دے دوں۔

اس نے قرآن کی ورق گردانی کرتے ہوئے کہا۔

نہیں چالیس ہزار سے کم نہیں ہوں گے۔

ایک شخص نے کہا۔

سیٹھ صاحب ! آپ کے منہ میں روزہ ہے۔ قرآن بھی سامنے لئے بیٹھے ہیں۔ پھر بھی جھوٹ بول رہے ہیں۔ بلیک مارکیٹ کر رہے ہیں۔ خود بے ایمانی کر رہے ہیں اور دوسروں کی بے ایمانی کو سراہتے ہیں۔ آخر یہ کس قسم کا اسلام ہے آپ کا ؟

وہ نوکری کی تلاش میں حاجی صاحب کے پاس آیا ہوا تھا مگر حاجی صاحب آج کل کر کے روزانہ اس کو ٹال دیتے ہیں۔

حاجی موسیٰ نے اسے لتاڑ کر کہا۔

جس قسم کا تمام لوگوں کا ہے۔ جاؤ اپنا کام کرو اور آئندہ میری دہلیز پر قدم نہ رکھنا۔

وہ شخص غصہ سے اٹھ کر چلا آیا۔

احمد نے کہا۔

تم نے بُرا کیا کہ اس کو نکال دیا۔ وہ ہماری تمام باتیں سُن گیا ہے۔

حاجی نے کہا۔

کر کیا سکتا ہے۔ اس کے پاس ثبوت کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے زبان کھولی تو اس دنیا میں نظر نہیں آئے گا۔

احمد نے کہا۔

تم نے اور بھی سنا۔ خان بہادر کریم نے ایک عورت کا اغوا کرایا تھا۔ اس میں اس کا شوہر بھی مارا گیا اور ادھر پولیس کے ہاتھ سے عبدل مارا گیا اور رزاق کا ہاتھ گولی لگنے سے ٹوٹ گیا مگر نصرو بچ نکلا۔

حاجی موسیٰ نے کہا۔

سیٹھ کریم بیوقوف ہے۔ اسمگلنگ اور اونچے داموں میں مال بیچنے میں تو اس نے اچھا دماغ پایا ہے مگر عورت کے معاملہ میں گدھا ہے۔

میرے ہاں رات دن یہی ہوتا ہے بلکہ میں عزت مآب تک کے لیئے سپلائی کا بندوبست کرتا ہوں مگر آج تک کسی کو کانوں کان خبر نہیں۔

احمد نے کہا۔

ہاں یہ تو سب ہتھکنڈے ہیں اپنے اپنے۔ مگر سنا ہے جس پولیس افسر نے عبدل اور رزاق کا کیس پکڑا تھا، اسے ترقی دے کر سپرنٹنڈنٹ پولیس بنایا جائے گا۔

حاجی موسیٰ بولا۔

جاوید کے متعلق کہہ رہے ہو۔ سپرنٹنڈنٹ اس کا باپ بھی نہیں بن سکتا۔ کریم کی مٹھی میں کون نہیں ہے۔ اس نے عزت مآب سے کہہ کر جاوید کی ترقی رکوا دی ہے۔

حاضرین میں سے ایک شخص بولا۔

یہ اچھا ہوا۔ ورنہ تو اور کریم کے کل کے لونڈے عبید نے بھی ایک لونڈیا پر ہاتھ صاف کرنا چاہا تھا۔

حاجی موسیٰ نے کہا۔

وہ لڑکا ابھی سے بڑا تیز ہے۔ ایسے ہی لڑکے بڑے ہو کر بڑا عہدہ پاتے ہیں۔

احمد بولا۔

خان بہادر کریم کی پارٹی بھی بڑی تیز ہے۔

حاجی موسیٰ نے کہا۔

پورے ملک میں چھائی ہوئی ہے۔ ہم بھر کون سے کسی سے کم ہیں۔

اور عصر کی نماز کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ایسے مذاق خدا سے رات دن ہوتے رہتے ہیں۔

فرید کی تبدیلی تعجب خیز تھی ابھی چند ماہ قبل وہ اگرچہ عبید کے طفلانہ جرائم کا شریک تو نہ تھا مگر اس کے دوستوں میں ضرور تھا۔ کچھ عرصہ پہلے نمائش میں جب ایک رات کو اس کے لئے عبید نے صفیہ کے بٹوے پر ہاتھ صاف کیا تھا تو اسے یقین نہیں آیا تھا کہ عبید اتنا بڑا کام کر گزرے گا۔

عبید آخر یہ کام کر گزرا اور فرید نے اس کے اس فعل کو پسند نہیں کیا تھا۔ پھر جب فرید نے عبید کی دکان پر صفیہ کو دیکھا تھا تو اسے افسوس ہوا تھا کہ ایسی اچھی عورت کا عبید نے بٹوہ چرایا

تھا۔

یہاں سے خاموشی کے ساتھ فرید کے ضمیر نے اسے ملامت کرنی شروع کی اور وہ عبید سے گریز کرنے لگا۔ یہاں تک چند روز بعد ہی دونوں میں اَن بن ہو گئی۔

اس دوران میں فرید کی نظر سے شمی بھی گزری اور یہ مغرور سی بالی عمر کی لڑکی فرید کے خونِ شباب میں چنگاریاں سی چھوڑ گئی۔ چونکہ وہ ابھی ابھی جوانی کی طرف آیا تھا تو جس لڑکی کی تابناکی نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ شمی ہی ثابت ہوئی۔ اس باب میں گلستانِ شباب کے اندر قدم رکھتے ہی شمی اس کے لئے سب سے پہلی شمع تھی۔

پھر اپنی شمع کے متعلق فرید نے عبید کے سفیہانہ اقدام کو ناکام بنا کر رہا۔

عین اغوا کے ہنگامے میں وہ نہ صرف پولیس کو بلا لایا بلکہ اس نے شمی کی امداد کے لئے چند آدمی بھی اکٹھے کر لئے تھے۔

لیکن افسوس شمی کی نظر میں اس کی ہمدردی اور امداد تو نہیں آئی۔ اسی کے بجائے بربنائے مغالطہ وہ فرید کو بھی عبید کا شریکِ کار سمجھی اور سمجھتی رہی۔ بس یہاں آ کر واقعات تھم گئے۔

شمی کے دل میں اس کے متعلق بدگمانی جم گئی اور فرید کی سُوجھ میں شمی جمی رہ گئی۔

یہاں سے فرید نے خود کو سنوارنا شروع کیا۔ چونکہ اسے شمی سے ملنے کے مواقع حاصل نہ تھے۔ اس وجہ سے وہ اس کے دل سے بدگمانی و سُوءِظنی تو نہ مٹا سکا مگر خود کو مٹانے لگا۔

اس نے بڑے اور نکوکار لوگوں کی سوانح کا مطالعہ شروع کیا اور جلد جلد خود پر مصلحانہ رنگ چڑھانے لگا۔ کیا یہ اس کی کوششیں شمی کی نگاہ میں خود کو ارفع کرنے کے لئے صرف ہو رہی تھیں اس کا علم خدا کو ہوگا۔

مگر وہ جو کچھ کر رہا تھا۔ بخلوصِ نیت کر رہا تھا۔ وہ اپنی اصلاح میں بھی صادق تھا اور دوسرے کے کام آنے میں صدق سے کام لے رہا تھا۔

کیا ایامِ شباب میں آپ پر تیزی سے مدوجزر نہیں گزرے ہیں۔ اگر کسی شخص نے تیز و حساس رُوح پائی ہے تو وہ ابتداء میں ضرور فرید کی جیسی کیفیات سے گزرا ہوگا۔ یہی احسن کیفیات جب جب پختہ رنگ اختیار کر لیتی ہیں تو انسان کو آئندہ کے مشاہیر کے زمرے میں لے جاتی ہیں اور اگر یہ محض ایک سطحی جوش ہوتا ہے۔

تو کچھ عرصہ بعد طغیانی اُتر جاتی ہے۔

غرض یہ تبدیلیاں فرید پر اس قدر سرعت سے گزریں کہ وہ خود بھی حیران رہ گیا اور اسے اس پر بھی تعجب ہوا کہ اپنے نئے مسعود رجحانات میں شوقِ تحصیلِ علم کو بھی وہ فروزاں محسوس کر رہا تھا۔

صفیہ کی بیوگی تک فرید کی یہ کیفیات تھیں اور اپنے مصلحانہ جذبات میں وہ شمی کا جلوہ بھی اپنی رُوح پر بدستور پا رہا تھا مگر ایک تو بے وسیلہ لڑکا تھا۔ دوسرے درسی کتب اس سے چُھٹی ہوئی تھیں جن سے عہدہ برآ ہونے کو اسے امتحانات کی تیاری کرنی پڑتی تھی۔ پھر بھی وہ وقتِ فرصت میں قومی کاموں کے لیے لمحات نکال لیتا تھا اور شمی کی یاد کے لئے بھی۔

دوسرے روز فرید کو اس کے ماموں جاوید نے مکان پر بلایا تھا مگر وہ نہ جا سکا۔ جاوید کو یہ توقع نہیں تھی کہ جو حادثہ صفیہ کو پیش آیا تھا۔ اس کی باریکیوں کو سمجھنے میں فرید سے مدد مل سکتی تھی۔ اسے فقط یہ موہوم سی امید تھی کہ ممکن ہے کہ اس طرح جرم کا کوئی سرا اس طرح ہاتھ آ جائے۔

فرید تین چار روز بعد جاوید کے مکان پر گیا تو اس نے سوال

کیا۔

میاں فرید! کیا تم کبھی عبید کے والد سے بھی ملے ہو؟

فرید نے جواب دیا۔

ایک دو بار میرا اتفاق عبید کے مکان پر جانے کا ہوا ہے۔
چنانچہ اس سلسلہ میں عبید کے والد کو میں نے دیکھا ضرور ہے۔
ان سے کوئی بات چیت کا موقع نہیں آیا۔

جاوید نے پوچھا۔

کس قسم کا ہے عبید کا والد؟

فرید بولا۔

اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ عبید بے شک مجھ سے ڈینگیں
مارا کرتا تھا کہ اس کا باپ ایک بڑا آدمی ہے۔

جاوید نے پوچھا۔

بڑے سے کیا مراد؟

فرید نے کہا۔

یہی کہ دولت مند و صاحب اثر۔

جاوید تحقیق کرنے لگا۔

کن لوگوں پر اثر ہے اس کا؟

فرید نے جواب دیا۔

اب یہ مجھے کیا معلوم ہاموں۔ پھر عبید سے آج کل میرے تعلقات بھی نہیں رہے ہیں۔

جاوید نے دریافت کیا۔

کیوں؟

فرید نے کہا۔

یہ سمجھئے کہ شمی کے اغوا کے متعلق جب عبید کی نیت میرے علم میں آئی تو میں نے اس اقدام سے اس کو سختی سے روکنا چاہا تھا۔ اس کے بعد بھی یہ اقدام کر گذرا تو میں نے اس کی گرفتاری میں مدد بھی کی تھی۔ بس یہیں سے میرے اور عبید کے تعلقات ختم ہو گئے۔

جاوید نے پوچھا۔

کیا تم نے کبھی ایک گنجے سے ادھیڑ عمر کے آدمی کو شمی کے مکان کے قریب بھی دیکھا تھا۔

گنجے سے اس کی مراد رزاق سے تھی۔

فرید نے جواب دیا۔

جی ہاں وہ اکثر ادھر سے ٹرک لے کر گزرتا تھا۔

اس کا یہ مطلب کہ صفیہ کے اغوا میں گنجا کسی کا آلہ کار تھا جاوید نے سوچا۔

ادھر اپنے طور پر پندرہ بیس روز بعد اس نے گنجے پر بھی سخت جرح کر کے کچھ ایسا اندازہ لگا لیا کہ ہو سکتا ہے وہ خان بہادر کریم کا آدمی ہو۔

اپنی اتنی پہنچ کے بعد جاوید نے سی آئی ڈی کے دو آدمیوں کو کریم کی طرف بھی لگا دیا مگر کریم کو پتہ چل گیا اور اس نے حکومت پر اپنے اثر کی بناء پر ایسا داؤ چلایا کہ جاوید کو نہ صرف سپرنٹنڈنٹ ہونے ہی سے رکوا دیا بلکہ دار الخلافہ سے اس کے تبادلے کے احکام بھی جاری کرا دیئے۔

اب جاوید کو یقین ہونے لگا کہ صفیہ کے اغوا اور اس کے شوہر کے قتل کے معاملہ میں ضرور کریم کی طرف پانی مرتا ہے۔ بہر حال جاوید کی ترقی رک گئی اور تبادلہ کے احکام کی بناء پر اسے شہر چھوڑنے کی تیاری کرنی پڑی۔

ایک روز جاوید نے فرید سے کہا۔

تم کسی روز اپنے طور پر صفیہ صاحبہ کے مکان پر جا کر ذرا دیکھ کر تو آؤ کہ ان کا کیا حال ہے؟

فرید نے کہا۔
میں چلا تو جاؤں ماموں مگر مجھ سے شمی ناراض ہے۔
جاوید نے دریافت کیا۔
کیوں؟
فرید نے یہ بتانا مناسب نہ سمجھا کہ بربنائے غلط فہمی اپنے اغوا میں شمی اسے بھی عبید کا ساتھی سمجھتی ہے۔ بہر حال خاموش ہو گیا۔

جاوید نے کہا۔
مگر میں تمہیں شمی کے پاس نہیں بھیج رہا ہوں بلکہ اس کی والدہ کے پاس روانہ کرنا چاہتا ہوں۔
فرید نے کہا۔
بہتر ہے ایک دو روز میں ہو آؤں گا۔
فرید سوچتا تھا کہ کس طرح اپنے باب میں شمی کی بدگمانی مٹائے۔ اتنی سمجھدار لڑکی ہے۔ کیا یہ بات اس کی عقل میں نہیں آسکتی کہ ایک بار بھی میں اس کے مکان پر عبید کے ساتھ نہیں گیا اور نہ کبھی میں نے اس کے ساتھ اپنا طرزِ عمل غیر شریفانہ رکھا۔

شمی نے آج تک نہ تو کسی اپنے برابر والے یا خود سے بڑے لڑکے کے حوصلے بڑھائے تھے بلکہ وہ ابھی سے خود کو اس قدر لیا دیا رکھتی تھی کہ اس کی ہمجولیاں بھی اس سے گھُل مل نہ سکی تھیں۔ ایسی لڑکی فرید صاحب نے پسند کی تھی۔

صفیہ نے فرید کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا۔

آؤ میاں فرید! آج کدھر بھول پڑے؟

جاوید نے کہنے کے مطابق کئی روز بعد وہ صفیہ کی خیر و عافیت معلوم کرنے آیا تھا۔

صفیہ اب تک فرید سے اچھی طرح واقف نہ تھی کیونکہ جس طرح عبید نے اس کے (صفیہ کے) مکان کے چکر شروع ہی لگانے شروع کئے تھے۔ اس طرح فرید کبھی اس کے محلہ میں نہ آتا تھا۔ اسی سبب سے وہ فرید کو برا لڑکا نہیں سمجھتی تھی۔

ویسے ہی آپ کی خیریت دریافت کرنے چلا آیا۔ آپ نے اچھا کیا کہ اپنے ایک دور رشتہ داروں کو بلا لیا۔ اکیلا گھر تھا اور وہ بھی دور۔

فرید نے باہر کے کمرے میں ایک ادھیڑ عورت اور ایک مرد کو دیکھا تھا۔

صفیہ نے کہا۔

وہ ہمارے رشتہ دار نہیں ہیں بلکہ پڑوسی ہیں۔ میں نے بستی کی خاطر انہیں اپنے مکان میں جگہ دے دی ہے۔

وہ عدت کے دن پورے کر چکی تھی۔

فرید نے کہا۔

یہ اچھا کیا آپ نے۔ اس کی ضرورت بھی تھی۔ ویسے ماموں نے بھی علاقہ کے سپاہیوں کو ہدایت کر رکھی ہے کہ آپ کے مکان کی نگرانی کریں۔ ماموں جان کہہ رہے تھے۔

صفیہ نے پوچھا۔

کون ماموں جان؟

فرید نے جواب دیا۔

جاوید ماموں۔

صفیہ نے دریافت کیا۔

اچھا وہ تمہارے ماموں ہیں؟ جاوید صاحب ماموں ہوتے ہیں تمہارے؟

اور اب فرید کو دیکھ کر اسے مسرت ہوئی، کیونکہ جاوید نے صفیہ کی مدد کی تھی۔ فرید ایسے ہمدرد انسان کا بھانجہ نکلا۔

فرید نے کہا۔

جی ہاں! اور آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ جاوید ماموں سپرنٹنڈنٹ ہونے والے ہیں۔

اسے علم نہ تھا کہ جاوید کی ترقی میں روڑے اٹکائے گئے ہیں، کیونکہ صفیہ کے مجرم خان بہادر کریم پر اس نے ہاتھ رکھنا چاہا تھا۔

صفیہ بولی۔ پھر اس نے پوچھا۔

خوب! بہت خوشی ہوئی۔ وہ اس عہدے کے ہر طرح مستحق ہیں۔

ہیں تو بخیریت جاوید صاحب؟

فرید نے کہا۔

جی ہاں۔ انہی نے مجھے آپ کی خیر و عافیت معلوم کرنے کے لئے

بھیجا ہے۔

صفیہ نے کہا۔

شکریہ ادا کرنا۔ ان کی والدہ صاحبہ تو خیریت سے ہیں۔ افسوس!

جب وہ اُن دنوں میں ازراہِ ہمدردی میرے پاس ایک دو روز رہی تھیں تو میں ان کی کوئی خدمت نہ کرسکی تھی۔ اب کسی روز ذرا نہیں یہاں تک آنے زحمت دینا۔

بہتر ہے، عرض کر دوں گا۔

صفیہ نے دریافت کیا۔

تمہارے امتحانات ہو گئے؟

فرید شمی کے متعلق دریافت کئے بغیر نہ رہا۔ وہ اس مکان میں نظر نہیں آرہی تھی۔

جی اگلے ماہ سے شروع ہو جائیں گے۔ کیا شمی صاحبہ بھی میٹرک کا امتحان دے رہی ہیں؟

صفیہ نے کہا۔

نہیں وہ اس سال نویں کا امتحان دے گی۔

فرید نے پوچھا۔

کہیں پڑھنے گئی ہوں گی؟

صفیہ نے کہا۔

نہیں۔ اب میں اسے اسکول کے علاوہ کہیں نہیں نکلنے دیتی۔ اُوپر کے کمرے میں پڑھ رہی ہے۔

صفیہ اپنے سفید لباس بیوگی میں بھی اچھی نظر آرہی تھی۔ اچھی عادتیں اور اچھی صورتیں ہر رنگ میں اچھی ہی نظر آتی ہیں۔ فرید تھوڑی دیر اور بیٹھا۔ اس کے بعد چلا آیا اور جاوید کو صفیہ کی خیرو عافیت پہنچا دی۔ جاوید کو بھی اطمینان ہوا کہ صفیہ نے اپنے مکان میں پڑوسیوں کو رکھ لیا ہے۔ اس کا اکیلا رہنا مناسب نہ تھا۔

جاوید کو ابھی اپنی ترقی رُکنے اور تبادلہ ہونے کا حکم موصول نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ سوچتا تھا کہ حکومت میں ایسا اندھیر تو کیا ہو سکتا تھا کہ ادائے فرض کے صلہ میں کسی کو ترقی نہ دی جائے اور اُلٹا تبادلہ کر دیا جائے۔ ممکن ہے یہ محض افواہ ہو۔ اسی وجہ سے اس کو توقع تھی کہ اس کی کارگزاری رائیگاں نہیں جائے گی۔

صلہ سے بے نیاز ہو کر اپنا فرض ادا کئے جانا ایک بہت بڑے ظرف اور کیریکٹر کا کام ہے۔ بیشک جاوید نے یہ کیریکٹر پا یا تھا لیکن کسی فرض شناس شخص کی خدمات کا اگر اعتراف نہ کیا جائے اور اس کے حوصلے نہ بڑھائے جائیں تو اس کا دل ٹوٹے

بغیر نہیں رہتا۔ یہ انسان کی فطرت ہے۔ مزدور خوش دل کند کار بیش۔

چنانچہ جاوید کو بھی اُمید تھی کہ اُسے ترقی ضرور ملے گی۔ اس نے افواہوں کی پرواہ نہیں کی۔ وہ اپنا مستقبل روشن پا رہا تھا۔ اس کے علاوہ آئی جی پولیس پہلے ہی بہت خوش تھا اور اس کی خدمات کو سراہتا رہتا تھا۔ انہی حقائق کو سامنے رکھ کر جاوید نے حال ہی اپنی ترقی کے بارے میں رکاوٹوں کی پرواہ نہیں کی۔ اس کے برعکس با امید تھا کہ پندرہ روز یا ایک ماہ بعد سپرنٹنڈنٹ ہو جائے گا اور حاسدوں کے حربے ان کے منہ پر پڑیں گے۔

اپنی اسی خوشدلی اور آئندہ کی بہتری کی امیدوں نے اس کے حوصلوں میں جان ڈال دی اور وہ زیادہ تندہی سے اپنے فرائض میں لگ گیا۔ ساتھ ہی صفیہ کا غم بٹانے کی تدابیر بھی سوچنے لگا۔

پولیس کا ہوشیار آدمی تھا۔ اس کے لئے یہ معلوم کر لینا کچھ دشوار نہ تھا کہ صفیہ کے مرحوم شوہر نے کوئی دولت نہیں چھوڑی تھی۔ اب وہ غریب بیوہ کس طرح زندگی گزارے گی اور کیسے اپنی ہونہار لڑکی کی تعلیم و تربیت اور بیاہ شادی کے لئے روپیہ کا انتظام

کرے گی۔

نہ اس کا ہرگز روادار نہیں ہو سکتا تھا کہ اپنی جیب سے صفیہ کا کچھ وظیفہ مقرر کر دیتا۔ اول تو صفیہ کی غیرت ہی اس کی متقضی نہیں ہو سکتی تھی۔ دوسرے خود جاوید کو لوگوں کی انگشت نمائی کا ڈر تھا۔

آخر دو چار روز بعد ایک تدبیر اس کے ذہن میں آئی اور اس نے اپنی والدہ سے مشورہ کیا۔

جاوید نے اپنی ماں سے کہا۔

اماں! آپ اکثر مجھ سے کہتی رہتی ہیں کہ بارِ دیگر کہیں اپنی شادی کر لوں۔ اگر میں اس بار آپ کے حکم کی تعمیل کر لوں تو آپ خوش ہوں گی نہ؟

اس کی والدہ بولیں۔

مجھ سے زیادہ کون خوش ہو سکتا ہے جاوید۔ تمہاری بیوی کے انتقال کو تین سال ہونے کو آئے مگر تم نے تو دوسری بار شادی کرنے کی ایسی قسم کھائی ہے کہ میرے لائے ہوئے کئی پیغامات کو ٹھکرا چکے ہو۔

جاوید نے مسکرا کر کہا۔

چلئے اب آپ کی خوشی ہو جائے گی۔

ماں نے کہا۔
کیا کوئی لڑکی پسند ہے تمہیں؟ خدا کا شکر ہے۔
جاوید نے کہا۔
جی ہاں۔ اور آپ بھی اس سے واقف ہو گئی ہیں۔
ماں نے پوچھا۔
اچھا! کون لڑکی ہے وہ؟
جاوید نے جواب دیا۔
لڑکی نہیں ہے۔ ایک نیک بیوہ ہے۔ صفیہ کو تو آپ جانتی ہیں۔
اس کی والدہ خاموش ہو گئی۔

اپنی والدہ کی خاموشی سے جاوید کو مغالطہ ہوا کہ اس کی والدہ کو صفیہ پسند نہیں آئی مگر واقعہ یہ نہ تھا۔ انہیں صفیہ اور اس کی لڑکی دونوں پسند تھیں مگر وہ اپنے لڑکے کے لئے کنواری لڑکی لانا چاہتی تھیں۔

لیکن انسانی ہمدردی نے انہیں بھی غور کرنے پر آمادہ کیا کہ صفیہ قابلِ امداد ہے۔ قابلِ امداد بیوگان سے عقد کرنا اسوۂ رسول ہے۔

آخر صفیہ کے معاملہ میں انہوں نے اپنی خوشنودی کا اظہار کر دیا جاوید کو بھی خوشی ہوئی۔

جاوید نے کہا۔
صفیہ نے ملنے کے لئے آپ کو بلایا ہے۔ آپ جب ان کے پاس جائیں تو میرا رقعہ بھی لیتی جائیں۔
والدہ نے کہا۔
رقعہ آج ہی لکھ دے۔ مبارک دن ہے۔ آج شام کو سے کر چلی جاؤں گی۔
چنانچہ جاوید صفیہ کو پیغام دینے کے لئے رقعہ لکھنے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔
کئی منٹ تک سوچتا رہا کہ کیا لکھے۔ یہ دو نوجوان مرد و عورت کی بے محابہ و احمقانہ محبت کا معاملہ نہ تھا بلکہ دو سنجیدہ عورت و مرد کی باہمی رفاقت و گہری ہمدردی کا سوال تھا۔ اس سلئے ایسے موضوع پر اسے سوچ بچار کر لکھنے کی ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ اس کے دل میں یہ کھٹکا بھی نہ تھا کہ اگر صفیہ نے اس کی تجویز سے اتفاق نہیں کیا تو فرطِ یاس سے اس کی (جاوید کی) بُری حالت ہو جائے گی۔
بہر حال اس نے مندرجہ ذیل ایک مختصر سا مضمون تیار کیا۔
صفیہ صاحبہ! آداب!!
فریدہ میاں سے آپ کی خیر و عافیت معلوم کر کے مسرت ہوئی۔

اماں نے کئی بار ارادہ کیا تھا کہ آپ سے دوبارہ ملیں۔ مگر محض اس خیال سے رک گئیں کہ آپ کو تکلیف نہ ہو۔

بہر حال آج آخر وہ آپ سے آہی ملیں۔ تنہا نہیں بلکہ میرا عریضہ لے کر آئی ہیں۔ امید ہے کہ آپ کو ناگوار نہیں گزرے گا۔

مجھے مختصر طور پر یہ عرض کرنا ہے کہ ہر انسان کو رفاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگرچہ اس دنیا میں اب مخلص رفیق کا ملنا تقریباً ناممکن ہو گیا ہے مگر اس میں مستثنیات بھی ہیں۔ انہی مستثنیات میں سے میں آپ کو سمجھتا ہوں۔ بیشک فرض میرا سب سے بڑا رفیق ہے مگر میں اپنے گھر میں ایک زندہ اور ہر وقت ساتھ رہنے والی مونس کی ضرورت شدت سے محسوس کرتا ہوں۔

کیا آپ از راہِ کرم میری روح کی اس احتیاج کو پورا کریں گی۔ اسے فقط ایک سچی درخواست سمجھئے۔ اصرار کی جرأت نہیں کر سکتا۔

مگر اندیشہ نہیں بلکہ یقین ہے کہ از راہِ حجاب آپ میری اس درخواست کا جواب نہیں دیں گی۔ اس صورت میں صاف طور پر عرض کرتا ہوں کہ آپ کی خاموشی کے معنی میں یہی سمجھوں گا کہ آپ نے میری درخواست قبول کر لی۔ میں یہ سمجھنے لیوں بھی

حق بجانب ہوں گا کہ اگر آپ میری استدعا کو قابل قبول نہ سمجھتیں تو انکار لکھ کر بھیج سکتی تھیں۔

بہرنوع آپ کی خاموشی کے بعد کے تمام مراحل امی طے کر لیں گی۔

والسلام

جاوید کی والدہ کو دیکھ کر صفیہ بہت خوش ہوئی اور اس نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ پانچ چھ ماہ قبل اپنے شوہر کے قتل کے بعد سے پھر اس کی ملاقات جاوید کی والدہ سے نہیں ہو سکی تھی۔

صفیہ نے کہا۔

میں تو یہ سمجھی تھی کہ اس روز کے بعد سے آپ ہمیں بھول گئیں؟

جاوید کی والدہ نے کہا۔

نہیں بیٹی! میں نے ایک دو بار جاوید سے کہا تھا کہ تمہاری خیر و عافیت معلوم کر جائے مگر اسے فرصت کہاں۔

ششی بھی انہیں پہچان کر بولی۔

اچھا یہ ممتا یار جاوید صاحب کی والدہ ہیں۔

جاوید کی والدہ نے اسے پیار کیا۔

جاوید کی والدہ نے مسکرا کر صفیہ سے کہا۔

تم تو نہیں بھولی تھیں مگر تمہاری بچی مجھے بھول گئی تھی۔
شمی نے کہا۔ پھر بولی۔
لیجئے! میں نے پہچان تو لیا آپ کو۔
جاوید صاحب تو پھر کبھی ہمارے مکان پر آئے ہی نہیں۔
جاوید کی والدہ نے مسکرا کر کہا۔
آئیں گے کبھی وہ بھی۔
چند منٹ بعد دونوں ماں بیٹی جاوید کی والدہ کے لئے چائے وغیرہ کے اہتمام کے لئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اب انہیں گھر میں کوئی ماما رکھنے کی استطاعت نہ رہی تھی۔
باوجود کوئی ذرائع آمدنی نہ رہنے کے صفیہ کے مکان سے اب بھی افلاس نہیں ٹپکتا تھا۔ اس کی وجہ اس کی سلیقہ مندی تھی۔ پھر بھی بنظرِ غور دیکھنے سے اندازہ ہو سکتا تھا کہ وہ اچھے دن نہیں گزار رہی تھی۔
صفیہ نے چائے کے دوران میں جاوید کی والدہ سے کہا۔
آپ تو اماں اب میرے ہی پاس آکر رہیئے۔
جاوید کی والدہ معنی خیز انداز میں مسکرا کر بولیں۔
ایسا ہی ہوگا انشاء اللہ۔

صفیہ اور جاوید کی والدہ میز پر قریب بیٹھی ہوئی تھیں۔ شمی ذرا فاصلہ پر تھی۔ شمی نک چڑھی کیا بلکہ مغرور مشہور تھی بلکہ جاوید کی والدہ کے ساتھ اس کا طرزِ عمل مغرورانہ نہ تھا۔

جاوید کی والدہ نے دریافت کیا۔

صفیہ بیٹی! تمہاری عدت کے دن تو گزر چکے ہوں گے؟

صفیہ نے ایک ٹھنڈا سانس بھر کر جواب دیا۔

جی ہاں۔

جاوید کی اماں نے کہا۔

رنجیدہ نہ ہو۔ خدا نے چاہا تو تمہارے غم جلد دور ہو جائیں گے۔

صفیہ اسی طرح مغموم لہجے میں بولی۔

یہ غم تو زندگی بھر کا ہے اماں!

جاوید کی والدہ نے کہا۔

کوئی غم تمام زندگی تک قائم نہیں رہتا۔ کچھ تو وقت کچھ دوسرے ہمدرد انسان مل کر دوسرے انسان کی پریشانیوں کو مٹا سکتے ہیں۔

صفیہ نے افسردگی سے کہا۔

جی ہاں مگر آج کل دوسرے کے ہاتھوں انسان کے غم و آلام ملنے

کے بجائے اور بڑھتے ہیں۔
جاوید کی والدہ نے کہا۔
یہ صحیح ہے مگر سچ پوچھو تو میں اس وقت تمہارے دل سے صدمہ دور کرنے کے لئے آئی ہوں۔
صفیہ نے کہا۔
یہ آپ کا کرم ہے۔ میں آپ کی اور جاوید صاحب کی مہربانیوں کی ہمیشہ معترف رہوں گی۔
حقیقتاً جاوید ہی تمہارا غم مٹانا چاہتا ہے۔ یہ دیکھو۔
یہ کہہ کر جاوید کی والدہ نے بیگ سے اپنے بیٹے کا لفافہ نکالا اور صفیہ کو دے دیا۔
صفیہ قدرے متحیر ہوئی۔ بہرحال لفافہ میں سے رقعہ نکالا اور اسے پڑھنے لگی۔
اپنی ماں کو کوئی خط پڑھتے دیکھ کر ششی بھی قریب آئی اور اس نے جھک کر رقعہ پڑھنا چاہا۔
جاوید کی والدہ مسکرا کر بولیں۔
اچھی بچیاں دوسروں کے خط نہیں پڑھا کرتیں۔
ان کے الفاظ پر ششی اپنی جگہ آ بیٹھی مگر دل میں کسی قدر توہ

پیدا ہو گئی کہ یہ کس کا خط ہے اور اس میں کیا لکھا ہے۔

جاوید کی والدہ کے ہاتھ سے لفافہ لیتے وقت صفیہ کو شک گزرا تھا کہ کہیں اس میں کوئی مطلب نہ ہو۔ بہر حال اس نے رقعہ پر سرسری نظر ڈالی اور اس کا شک قوی ہو گیا۔ خط کا مضمون جلدی میں اس کی فہم کے پردوں کو ہلاتا ہوا گزر گیا۔ اس کے بعد اس کے چہرے پر نادانستہ حیا سی دوڑ گئی اور رقعہ واپس لفافہ میں فوراً رکھ دیا۔

فضا قدرتاً شرم وحجاب کی پیدا ہو گئی تھی کیونکہ یہ مشرقی گھرانا تھا حالانکہ وہ گہری شرم جو ایسے موضوع پر عورت اپنی ابتدائے جوانی میں محسوس کرتی ہے۔ اب صفیہ کے شایاں نہ رہی تھی مگر پھر بھی بیٹے کا پیغام لانے والی بڑی بی کے آگے صفیہ حیا محسوس کئے بغیر نہ رہی۔

رقعہ دینے کے بعد جاوید کی والدہ بھی اب اپنی موجودگی کو بار سا محسوس کرنے لگی تھیں۔ چنانچہ مسکراتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

انھوں نے کہا۔

اچھا بیٹی! اب مجھے اجازت دو۔ پھر کبھی آؤں گی۔

صفیہ نے کہا۔

واہ! میں آپ کو شام کا کھانا کھائے بغیر نہیں جانے دوں گی۔

جاوید کی والدہ نے کہا۔

کھانے میں مجھے کیا عذر ہو سکتا تھا مگر میں دن میں فقط ایک ہی دفعہ کھاتی ہوں کیونکہ دونوں وقت کا کھانا معدہ قبول نہیں کرتا۔

صفیہ نے کہا۔

اچھا تو کوئی ہلکی پھلکی چیز تیار کر دوں گی آپ کے لئے۔

جاوید کی والدہ نے کہا۔

اس کی کیا ضرورت ہے۔ کسی روز دوپہر ہی کو آ کر اچھی طرح تمہارے ساتھ کھا لوں گی۔

اچھا تو اتوار کو دوپہر کا کھانا ہمارے ساتھ ہی کھایئے اور......

صفیہ رک گئی۔

شاید وہ کہنا چاہتی تھی کہ جاوید صاحب سے بھی کھانے

کے لئے کہہ دیجئے مگر اب جاوید کو کس طرح بلا سکتی تھی وہ۔

یہ مجھ پر چھوڑ دو۔ کسی بھی دن آ جاؤں گی اور ایک روز قبل تمہیں اطلاع کر دوں گی۔

جاوید کی والدہ نے کہا۔ اس کے بعد رخصت ہو گئیں۔

ان کے چلے جانے کے بعد صفیہ پر جاوید کے رقعہ کا رد عمل تیزی سے ہونا شروع ہوا۔ اس ردِ عمل کے پہلے حملہ سے وہ بھونچکی سی رہ گئی۔ اچھا جاوید مجھ سے نکاح کے خواہاں ہیں! یہ انہیں لازم نہ تھا۔ انہوں نے آخر اس خواہش کا مجھ ہی سے کیوں اظہار کیا۔ سب سے پہلے اس قسم کا سوال ناگواری سے اس کے دل میں گزرا۔

کیا انہوں نے مجھے کوئی گئی گزری عورت سمجھا ہے کہ بیدھڑک اپنا پیغام کھینچ مارا۔ بیشک انہوں نے مجھے بدمعاشوں کے پنجے سے چھڑا کر میری آبرو بچائی مگر اس کے یہ تو معنی نہیں کہ اس سلوک کے عوض انہوں نے مجھے خرید لیا ہے۔ دوسرا یہ خیال اس کے دل میں گزرا۔

اپنی اس دفعتہً چھا جانے والی الجھن میں وہ جاوید کے ابھی

ابھی سرسری نظر سے پڑھے ہوئے رقعہ کا مضمون کھل گئی تھی۔ اور اس کے مفہوم سے کشاکش کرنے لگی تھی۔ آخر اٹھی اور دوسرے کمرے میں جا کر اطمینان سے اس نے جاوید کا رقعہ پڑھنا شروع کیا ایک بار پڑھ کر دوبارہ پھر پڑھا اور اس میں اسے کوئی ناگوار گذرنے والی بات نظر نہ آئی۔ کسی احسان کی نمائش کا شائبہ دکھائی نہ دیا۔ کسی اصرار یا اجبار کا اس میں وجود نہ تھا۔

اب اسے اطمینان ہوا۔ اس کے بعد اس پر آہستہ آہستہ عورت کے جذبات طاری ہونے لگے مگر عمر نے ان جذبات میں رقت کے بجائے حقیقت فہمی کو نمایاں رکھا۔ اسے اپنے اور اپنی لڑکی کے سوال کا خیال آیا اور جیسا یہ حال تھا اسے دونوں ماں بیٹی اچھی طرح محسوس کر رہی تھیں۔

پھر مستقبل جس کو ایک پاگل شخص کے علاوہ شاید ہر شخص ہی امیدوں کے سہارے سہاؤنا پاتا ہے یا سہاؤنا دیکھنے کی تمنا کرتا ہے حفیہ کے سامنے اپنی سالم زندگی پڑی تھی اور اپنی نویلی بیٹی کے مستقبل کا سوال پھیلا ہوا تھا۔ وہ عورت ذات کس طرح آئندہ کے غیر یقینی زمانہ کا اکیلی مقابلہ کرے گی۔

بیشک اسے ایک ساتھی کی ضرورت تھی۔ ایسے ساتھی کی جو

اعتماد پرور ہو۔ اس کا ہو اور دائمی اسی کا رہے۔ اس کی عزت اور شمی کی تعلیم، آئندہ کے مصارف، مستقبل اور شادی بیاہ میں باپ کی طرح حصہ لے اور یہ سب کچھ لعنتِ بیوگی سے چھٹکارا پانے کے بعد ہی ہو سکتا تھا۔ اس سے چھٹکارا دینے والا جاوید ہی کیوں نہ ہو۔

اتنا سوچ کر صفیہ نے اپنی بیٹی سے بھی مشورہ کرنا چاہا کیونکہ وہ سمجھ دار واقع ہوئی تھی۔

آخر دوسرے روز صفیہ نے اپنی لڑکی سے جاوید کا تذکرہ چھیڑا۔

شمو! جاوید کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟

شمی نے دریافت کیا۔

کیسا خیال؟ کاہے کا خیال؟

صفیہ نے جواب دیا۔

اسے اپنا مستقل سرپرست بنانے کا خیال۔

شمی نے پوچھا۔

کیا وہ ہمارا کوئی مستقلاً وظیفہ مقرر کرنا چاہتے ہیں؟

وہ شاید کسی قدر سمجھ تو گئی تھی مگر ابھی بات صاف نہیں ہوئی تھی۔

صفیہ مسکرا کر بولی۔

کیا وہ تمہیں اتنا دولت مند نظر آتا ہے کہ اپنی جیب سے کسی کا وظیفہ مقرر کر سکے اور کیا ہم ایسے گئے گزرے ہیں کہ کسی کا وظیفہ قبول کر لیں گے؟

ششی نے کہا۔

میں کچھ سمجھ تو گئی ہوں امی مگر اس خوف سے کہ آپ خفا نہ ہو جائیں ٹال رہی ہوں۔

صفیہ مسکرانے لگی اور خاموش ہو گئی۔

ششی نے اسے خاموش پا کر کہا۔

آپ جانتی ہیں امی کہ میں بہت کم کسی کو پسند کرنے کی عادی ہوں۔ اس کے علاوہ یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ میں ہر کس و ناکس کا خواہ مخواہ مطالعہ نہیں کرتی۔ چنانچہ کہہ نہیں سکتی کہ جاوید باطن میں کیسے آدمی ہیں۔

صفیہ نے دریافت کیا۔

انسان اپنے طرزِ عمل سے بھی پہچانا جا سکتا ہے۔ بیشک بہت سے لوگ منافقانہ یا خود غرضانہ بھی اپنا طرزِ عمل اچھا ظاہر کرتے رہتے ہیں۔ لہٰذا مجھے یہ بتاؤ کہ آیا تم نے جاوید

کے طرزِ عمل میں کوئی ایسی بات پائی۔

سشمی بولی۔

اب آپ دریافت کرتی ہیں تو میرا یہ کہنا کیا غلط ہو گا کہ ہمارے ساتھ ان کے حسن سلوک میں آپ کی ذات کا خیال شامل نہیں ہو سکتا

صفیہ نے کہا۔

بمشکل کیونکہ نہ تو ہم امیر ہیں نہ صاحب جائداد غرض ہم میں کوئی خصوصیت نہیں۔

اپنے گھرانے میں خصوصیت سشمی کو بھی نظر نہ آئی اور اس خیال کے ساتھ ہی اسے احساس ہوا کہ پھر اسے کس چیز پر ناز تھا۔ (سشمی اپنی عادتوں میں ذرا مغرور سی واقع ہوئی تھی)

مگر سشمی ایک تو ابھی نو عمر تھی۔ دوسرے مرد کے جذبات سمجھنے سے قاصر تھی۔ اس لئے صفیہ کے باب میں جاوید کی پسندیدگی کو نہیں تاڑ سکی تھی۔

صفیہ نے کہا۔

مجھ سے زیادہ تمہیں ایک مستقل نگران کی ضرورت ہے۔ میں تو اپنی عمر کا کافی حصہ گزار چکی ہوں۔ بہرحال جیسا کہ جاوید نے اپنے

رقعہ میں تحریر کیا ہے کہ کوئی زبردستی نہیں ہے۔ ہم انہیں مسترد
کر سکتے ہیں۔

ششی نے کہا۔

ابھی مسترد نہ کیجئے امی۔ ویسے نگرانی کی ہم دونوں محتاج نہیں۔
میں آپ کی نگرانی کر سکتی ہوں۔

صفیہ ہنسی۔

صفیہ نے کہا۔

نہیں ششی اس لاقانون اور وحشیوں کے ملک میں تمہیں زیادہ
محافظ کی ضرورت ہے۔

ششی خاموش ہو گئی اور کچھ سوچنے لگی۔

ہرچند الفاظ کے ذریعہ دونوں ماں بیٹی میں اس موضوع پر صاف صاف گفتگو نہ ہو سکی اور یہ ہو بھی نہیں سکتی تھی لیکن دونوں اپنے اپنے طور پر مطمئن تھیں کہ جاوید کی درخواست بجا تھی۔

صفیہ کو تو اس بات کی خوشی تھی کہ اس کی لوٹی ہوئی زندگی کو پھر سہارا مل رہا تھا۔ مرجھائی ہوئی ٹہنی دوبارہ شاداب ہونے والی تھی اور رشمی اس سبب سے اطمینان ظاہر کر رہی تھی کہ کفیل کے مل جانے سے اس کی آئندہ تعلیم کا سلسلہ جاری رہ سکے گا۔ اس کے ساتھ ہی حمید جیسے اوباش لڑکوں اور مردوں کے خلاف

کوئی اس کی حفاظت کر سکے گا۔

بہر حال اپنی آئندہ کی زندگی کے اچھے پیام سے صفیہ کو بڑی ڈھارس ہو گئی تھی۔ کیسا تاریک ملک ہے یہ۔ ایک وہ ممالک ہیں کہ جہاں عورت دنیا کے اس سرے سے اس سرے تک نڈر پھرتی ہے۔ کیا مجال کہ کوئی اسے چھونے کی جرات کر جائے۔ تا وقتیکہ وہ خود ہی نہ گر جائے۔

ایک یہ ملک ہے کہ اپنے ہی وطن کے کسی معمولی سے شہر بلکہ قصبہ میں کسی خاموش راستے سے عورت کیا مجال کہ اپنی آبرو محفوظ لے کر نکل سکے۔ آدمی وہاں بھی بستے ہیں۔ آدمی یہاں بھی بستے ہیں۔ خواہشیں اُن سے بھی لپٹی ہوئی ہیں، اِن سے بھی لپٹی ہوئی ہیں۔

مگر ان میں اور ہم میں ایک نمایاں فرق ہے۔ وہاں کے محبّ وطن عمال نے انہیں پوری تعلیم دلائی۔ مکمل شہری حقوق عطا کیے۔ روزگار بخشا۔ جو خود کھایا انہیں کھلایا۔ یہاں کے عمال نے انہیں کندۂ ناتراش، جاہل اور لوفر رکھنے ہی میں اپنے اقتدار کی خیر و بقا سمجھی۔ خود خوب کھایا۔ انہیں فاقوں میں مبتلا کیا۔ خود نے زمین، جائداد اور کوٹھیاں بنوالیں۔ ایئر کنڈیشنڈ قیمتی کاریں

اپنے جسم بخس کی آسودگی کے لئے خریدیں اور عوام کو آسمان کی چھت کے نیچے ڈال کر دھوپ میں سڑنے اور بارش میں گلنے کے لئے ڈال دیا۔

صفیہ کو بھی اپنے سر پر ایک سائبان کی ضرورت تھی تاکہ وہ اس وحشی ملک کی ننگی شہریت کے خلاف اپنے سائبان کے نیچے پناہ لے سکے اور یہ سائبان جاوید یا اس جیسا کوئی نیک مرد ہی بخش سکتا تھا۔

پھر وہ سائبان جاوید ہی کیوں نہ ہو۔ وہ اچھا خاصہ ایک مردِ معقول تھا۔ اس سے قطع نظر کہ اس نے صفیہ کے شوہر کے قاتلوں کو پکڑا تھا اور اس کی آبرو بچائی تھی۔ یہ تو اس نے اپنا فرض ادا کیا تھا لیکن اس کے علاوہ وہ اس کا ہمدردانہ رویہ علیحدہ تھا، جسے وہ بھول نہیں سکتی تھی۔

بہرحال جاوید نے اپنے رقعہ میں لکھا تھا کہ اگر اس نے جواباً تردیدی خط نہ بھیجا اور اس کی بجائے خاموشی اختیار کی تو وہ اسے صفیہ کی رضامندی سمجھے گا۔ چنانچہ صفیہ نے جاوید کے رقعہ کا جواب نہ دے کر گویا اسے (جاوید کو) قبول کر لیا تھا۔ یہ گویا جاوید کے لئے پیامِ مسرت تھا اور صفیہ کے لئے وجہِ انبساط۔

بس صفیہ جاوید کے رقعہ کے جواب میں خاموشی اختیار کر کے خوش تھی اور انتظار کر رہی تھی کہ چند روز میں جاوید کی والدہ آیا ہی چاہتی ہے اور اس دفعہ اس کی آئندہ کی زندگی کے لئے مستقل سامان لے کر آئیں گی۔

آخر ایک روز جاوید کی والدہ نے اس سے دریافت کیا۔

جاوید! کیا صفیہ کا کوئی جواب آیا؟

جاوید نے جواب دیا۔

نہیں اماں! اگر آتا تو آپ کو ضرور بتاتا۔

اس کی والدہ بولیں۔

شکر ہے۔ اس کے یہ معنی کہ اس نے تمہارا پیغام قبول کر لیا ورنہ اس کے برعکس بات ہوتی تو کچھ لکھتی ضرور، دو ماہ ہونے کو آئے۔

جاوید نے کہا مگر اس کے لہجہ میں کوئی شادمانی نمایاں نہ تھی۔

جی ہاں! اس باب میں صفیہ میرے اور آپ کے شکریئے کی مستحق ہیں۔

ماں نے کہا۔

پھر تم خاموش کیوں بیٹھے ہو۔ جا کر مجھے بات پختہ کر آنے دو۔

میں پچھلے کئی روز سے سخت خلفشار میں مبتلا ہوں اماں!

کیوں۔ کیا ہوا؟

جاوید نے جواب دیا۔

وہی حسین کا اندیشہ میں نے دل سے خارج کر کے صفیہ کے پاس پیام روانہ کیا تھا۔

والدہ نے کہا۔

میں سمجھی نہیں۔

جاوید نے کہا۔

یعنی وہ افواہیں اب صحیح ثابت کر دی گئیں۔ میری ترقی روک دی گئی ہے اور میرا تبادلہ اپنے موجودہ عہدے پر ہی یہاں سے کیا جا رہا ہے۔

اس کی والدہ خاموش ہو گئیں۔ انہیں رنج ہوا تھا۔

اس کی والدہ نے حوصلہ افزا الفاظ ادا کرتے ہوئے کہا۔

یہ رنجدہ خبر ہے۔ خیر اللہ پر بھروسہ رکھو۔ آئندہ جاکر تمہاری نیک نامی و نیک نیتی ضرور کام آئے گی۔

جاوید چپ ہو گیا۔

والدہ نے کہا۔

خیر جو ہونا تھا وہ ہو گیا لیکن اس سے تم اتنے بددل کیوں ہو گئے کہ تم نے صفیہ کے معاملہ میں بھی خاموشی اختیار کر لی۔ تمہاری ترقی وغیرہ کا صفیہ سے کیا تعلق؟

جاوید نے کہا۔

تعلق میں نے خود پیدا کر دیا تھا اماں۔ صفیہ کو میں نے رقعہ میں یہ لکھ دیا تھا کہ جلد سپرنٹنڈنٹ ہونے والا ہوں لیکن میں بنا رہ گیا نہ ہی ڈی ایس پی۔ چنانچہ کیا وہ میری تحریر کو غلط بیانی و شیخت نہیں سمجھے گی۔

ماں نے کہا۔

یہ تو تمہارا خیال ہے۔ صفیہ کو تمہاری ضرورت ہے یا تمہارے عہدے کی؟

جاوید نے کہا۔

انہیں خواہ کسی کی بھی ضرورت ہو لیکن ایک شوہر کو اپنی

بیوی کی نگاہ میں ہمیشہ پابند ہی رہنا چاہیئے۔ اب میں اپنی موجودہ پوزیشن میں صفیہ سے رجوع کرتا ہوں تو وہ مجھے شاید جھوٹا یا فریبی سمجھیں گی۔

اس کی والدہ بولیں۔

یہ تمہارا خیال ہے ورنہ اتفاق کے پیدا کردہ تمہارے حالات کے خلاف صفیہ کی تم سے بدگمانی کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

جاوید بولا۔

نہیں امی! مجھے وقت کا انتظار کرنے دیجئے۔ اس کا آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر میں نے کبھی دوسری شادی کی تو صفیہ ہی سے کروں گا۔

اس کی والدہ خاموش ہوگئیں۔ کیا صفیہ کبھی جاوید کی بحالی و ترقی کا انتظار کر سکے گی۔ وہ سوچ رہی تھیں۔

جلدی از سماج دشمن عناصر جاوید کی بے لاگ کارگزاری وغیرہ سے خائف تھے اور اس سے جلتے تھے اپنا کام کرگزرے، جاوید تو خیر ایک معمولی سا پولیس افسر تھا۔ یہاں تو وزارت تک اسمگلروں، چوربازاری کرنے والوں اور غداروں کے زیرِ اثر تھی۔

کوئی وزیر، کوئی بڑا سرکاری عہدیدار ایسا نہ تھا جو ملک دشمن عناصر کی مٹھی میں نہ ہو۔ کہنے کو یہاں قومی اسمبلی بھی موجود تھی۔ اور آئین بھی تھا مگر یہ سب کچھ معطل چیزیں تھیں۔ اصل حکومت

ان لوگوں کے ہاتھوں میں تھی جو حکومت سے باہر رہ کر بد قسمت ملک کے سیاہ سفید کے مالک بنے ہوئے تھے۔

جاوید یا اس جیسے چند اُنے گِنے فرض شناس افراد کو کونے میں ڈال دیا گیا تھا کہ لاقانونیت کا طوفان چھایا رہے اور کبھی لمحۂ محشر ہونے ہی نہ پائے۔

وہ نوجوان جو اس روز حاجی موسیٰ کے پاس بتلاشِ معاش آیا تھا مگر حاجی موسیٰ کے اسلام پر معترض ہونے کی وجہ سے نہ صرف اسے وہاں روزگار نہ مل سکا تھا بلکہ نکال بھی دیا گیا تھا۔ فرید ہی کا ایک ہم جماعت تھا۔ اور اس کا نام اختر تھا۔

اختر و فرید میں خاصی دوستی تھی کیونکہ دونوں عبید کی آوارہ و اوباشانہ سوسائٹی سے متنفر ہو کر اس سے قطع تعلق کر چکے تھے۔ اختر بھی فرید کی طرح ملک و ملت کی خدمت کے جذبات سے خالی نہ تھا مگر اس روز حاجی موسیٰ اور اس کے حواریوں کی ڈھلوسوز کارروائیاں اور ان کی گندی سرمایہ دارانہ حرکات دیکھ کر سخت بددل ہوا تھا۔

اختر نے سوچا کہ جب اس حمام میں سب ہی ننگے ہیں تو وہ کیوں اپنے کپڑوں کا بوجھ لئے پھرے۔ چنانچہ اپنا مستقبل

بنانے کے لئے وہ بھی ناجائز ذرائع اختیار کرنے پر غور کرنے لگا۔ کاش ایسے نامبارک اقدام سے پہلے وہ فرید سے مشورہ کر لیتا۔ امید تھی کہ فرید ایک فرد کو بُرا شہری ہونے سے روک دیتا۔

مگر اختر تو اپنی بیکاری رفع کرنے کے لئے ہر جائز و ناجائز اختیار کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اس طرح وہ بھی نادانستہ عبید کے ٹائپ کا انسان بن رہا تھا حالانکہ اب وہ اس کی سوسائٹی کا آدمی نہ تھا بلکہ اس سے نفرت کرنے لگا تھا۔ عبید سے اختر نے اسی بنا پر تو نفرت کا آغاز کیا تھا کہ وہ (عبید) ایک بُرا لڑکا تھا اور اس نے منّی کو اغوا کرنے کی ناکام کوشش کر کے انتہائی پستی کردار کا ثبوت دیا تھا۔

لیکن یہ انسان کی فطرت ہے کہ اسے اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا بلکہ دوسروں کی آنکھ کا تنکا بھی نظر آجاتا ہے۔ اختر کا خیال تھا کہ اگر ایک اس اکیلے نے اپنے مفاد کی خاطر کوئی ہلکا سا جرم کر لیا تو اس میں کون سا غضب ہو جائے گا۔ ملک تباہ ہو جائے گا یا سوسائٹی زہریلی ہو جائے گی۔

یہ اختر کی سخت بھول تھی۔ بے شمار شہری یہ سوچتے ہیں۔

آپ سڑک پر چلتے چلتے چپکے سے ایک طرف تھوک دیتے ہیں یا کوئی سنسان گلی آنے پر آنکھ بچا کر پیشاب کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ سوچتے یہ ہیں کہ کون دیکھتا ہے اور اگر میں نے یہاں پیشاب کر لیا تو محلہ کون سا سڑ جائے گا۔

اس باب میں شاید آپ نے وہ حکایت تو سنی ہوگی کہ ایک دفعہ کسی شہر کے دودھ والوں کو حکم دیا گیا کہ راتوں رات بڑے حوض کو دودھ سے بھر دیں۔ چنانچہ دودھ کا پہلا ڈول لوٹنے والے گھوسی نے سوچا کہ رات کا وقت ہے۔ کون دیکھے گا کہ میں نے حوض میں کیا ڈالا ہے۔ یہ سوچ کر اس نے دودھ کے بجائے حوض میں پانی ڈال دیا۔

دوسرے گھوسی نے بھی یہی سوچا ہوگا۔ تیسرے چوتھے اور آخری ڈول لوٹنے والے نے بھی یہی سوچا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صبح حوض کو دیکھا گیا تو وہ پانی سے لبریز تھا اور اس کے اندر دودھ کا ایک قطرہ بھی نہ تھا۔

یہ خیال کرنا کہ اگر میں کوئی غلط کام کر دوں تو کون دیکھنے والا بیٹھا ہے۔ یہ مجرمانہ خیال انسان کو واپس حیوانیت کی طرف لے جاتا ہے۔ اسی ایک انسانیت سوز خیال سے صدہا جرائم

پیدا ہو جاتے ہیں ۔ قتل ، ڈکیتی ، چوری ، اغوا ، جھوٹ ، فریب وغیرہ ۔

پھر اپنے کسی غلط خیال کو آگے بڑھانے والا ایک منٹ کے لئے دل پر ہاتھ رکھ کر یہ بھی تو سوچے کہ اگر کوئی شخص اس کے قتل کے درپے ہو جائے تو اس پر کیسی بیتے گی ۔ کوئی اس کے ہاں چوری کرنے آ گھسے تو کیا وہ اس کے خلاف پہلے خود پھر محلے والوں اور قانون کا سہارا نہیں پکڑے گا اور اگر کوئی اس کی بہن بیٹی یا بیوی کا اغوا کر لیا جائے تو اس کے جذبات پر کیسی گذرے گی ۔

خدا کا خوف کچھ نہ سہی ، بندے کا قانون بے معنی سہی لیکن اپنی ذات کا تحفظ و بقا تو کوئی چیز ہے ۔ نہ جرم کرے مگر یہ بھی تو سوچے کہ دوسرے مجرم جب اسی کی طرح لگے تھکا جرم کرنے لگتے ہیں تو وہ چیختا کیوں ہیں ۔

یہ دراصل سب کچھ جہل کا نتیجہ ہے ۔ جب تک تعلیم عام نہ ہو گی اور لکھے پڑھے لوگوں کی اعداد کم از کم پچاس فیصدی تک نہ پہنچ جائیں گے ۔ ان جاہلوں اور کندہ ناتراش لوگوں کے ہاتھوں زیر بنائے جہل و بے علمی معاشرہ تباہ ہوتا رہے گا جرم پھیلتے

رہیں گے۔ ان میں قومی جذبہ کبھی پیدا نہ ہوگا۔ وہ جمہوریت کے ہرگز قابل نہ ہوں گے اور حکومت کے لئے زنہار اپنے صحیح نمائندوں کا انتخاب نہیں کر سکیں گے۔

اختر تو ابھی میٹرک پاس بھی نہ کر سکا تھا۔ فرید کا ہم جماعت ہی تھا مگر فرید میٹرک میں کامیاب ہو گیا تھا اور اختر رہ گیا تھا مگر محض میٹرک یا یونیورسٹی کی ڈگری تعلیم کی سند نہیں۔ تعلیم کی سند تو اس میں ہے کہ جو کچھ پڑھا ہے (خواہ تھوڑا ہی) اس پر عمل بھی کیا ہے اور اس سے اپنا کیریکٹر بھی بنایا ہے۔

فیل ہو جانے کے بعد اختر چونکہ اسکول کو خیرباد کہہ چکا تھا۔ اس لئے فرید سے اس کی ملاقات دو تین ماہ سے نہیں ہوئی تھی۔ پھر فرید نے کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ اس کے علاوہ خدمتِ خلق اور قومی کاموں میں اسے روحانی سکون محسوس ہونے لگا تھا۔ اس وجہ سے کہیں آنے جانے کو اس کے پاس وقت بھی نہ رہا تھا۔

حتیٰ کہ وہ اپنے نئے مبارک جذبات میں پرانے چندے منشی کو بھی بھول گیا تھا۔ اس سے ملنے یا اس کو دیکھنے کے امکانات تو لے سے پہلے بھی حاصل نہ تھے اب کیا ہوتے۔ اس کے علاوہ

اس کے فرض شناس و مستعد کارناموں کے دشمنوں نے سازش کر کے تبادلہ بھی کرادیا تھا ورنہ اسی کی جانب سے وہ کبھی صفیہ کی خیر و عافیت دریافت کر آتا اور اس طرح شمی کی زیارت بھی ہو جاتی۔

غرض مل اور روح کے درمیان جو رشتہ ہے وہ شمی کی وجہ سے فرید قدرے کھو چکا تھا کیونکہ تعاون و درماندگی کے عالم میں اسے کچھ عرصہ بعد شمی کا خیال آ ہی جاتا تھا۔ حالانکہ شمی نے اس کے دل کی درماندگی رفع کرنے کی کوئی توقع نہیں دلائی تھی بلکہ وہ اب تک اسے علیحدہ ہی کی پارٹی کا آدمی سمجھنے کی بدگمانی میں مبتلا تھی۔

فرید نے اپنے قومی پروگراموں کو کامیاب بنانے کے لئے اخبارات میں لمبے لمبے واعظانہ بیانات شائع کرنا سعی مہمل سمجھا۔ اسی طرح پلیٹ فارم پر جاکر کوئی اصلاحی تقریر خطیبانہ انداز میں جھاڑ آنا بھی اسے بالکل غلط طریقہ نظر آیا۔ گیارہ بارہ سال سے یہی تو ہو رہا تھا۔ وزراء یہی تو کہہ رہے تھے۔ جو وزیر بھی کرسی وزارت پر قابض ہوتا ہے اسلام کا درد، قوم کا درد، ملک کا درد اس کے منہ سے جھڑتا تھا۔ اس کی اس منافقانہ دردمندانہ تقاریر سے بعض اوقات تو ایسا معلوم ہونے لگتا تھا۔ گویا فرط درد سے اب اس کا سینہ شق ہوا۔

ان تمام کا نتیجہ کیا ہوا۔ قوم کو فقط نعروں کا چسکہ لگ گیا۔ وہ محض جذباتی بن کر رہ گئی اور اس کے اندر قوت عمل ننا ہو کر رہ گئی۔ اس نے صرف ایسے ہی لیڈروں کے دماغوں سے سوچنے کی عادت ڈال لی اور خود بھی انہی کی طرح نکمی، سہل انگار اور منافق ہو گئی۔

اس طرح پہلے فرد بگڑا، پھر بہت جلد پوری قوم بگڑ گئی۔ اس عام ابتری میں فرید کا نہ بگڑنا کوئی معجزہ نہ تھا۔ شروع میں بگڑنے وہ بھی لگا تھا۔ اگر عبید کے ساتھ رہتا تو وہ بھی اسی کی طرح ایک بگڑا ہوا شہری بنے بغیر نہ رہتا۔

ایک روز فرید کو بازار میں اختر نظر آ گیا۔ اس نے اختر کو آواز دے کر روکا۔

اختر نے رُک کر کہا۔

تمہیں معلوم ہونا چاہیئے فرید کہ اب میرا نام اختر نہیں ہے۔ اختر اب میرا تخلص سمجھو۔

فرید نے مسکرا کر دریافت کیا۔

اچھا! کیا تم شاعر بھی بن گئے؟ کب سے؟

اختر نے کہا۔

یہ ضروری نہیں کہ تخلّص اختیار کرنے کے بعد شعر ضروری کہا جائے
پھر آج کل تو لوگ دوسرے کی غزل اپنے نام سے پڑھ دیتے ہیں
میں بھی ایسا کر سکتا ہوں۔

فرید نے پوچھا۔

خیر اچھا یہ بتاؤ کہ آج کل کیا کر رہے ہو؟

اختر نے جواب دیا۔

ایک فرم میں ٹائپسٹ ہوں۔ پونے دوسو روپے ملتے ہیں۔

فرید بولا۔

چلو یہ اچھا ہوا ورنہ میٹرک پاس کرنے میں تمہارا ایک سال
پھر برباد ہوتا اور میٹرک کے بعد یہی تنخواہ ملتی۔

اختر نے ناگواری کے ساتھ اس کے الفاظ سنے پھر دو چار
باتیں کر کے چل دیا۔

پوری قوم سیاہ کار و گنہگار بن گئی۔ کیونکہ ایسے ہی لوگ اس پر حکومت کر رہے تھے۔ اس قوم میں کوئی انقلاب لانے کی صلاحیت بھی نہیں رہی تھی۔ کیونکہ ہر فرد و بشر بزدل، عیش کا غلام، نکما اور کاہل ہو گیا تھا۔

یہ مجرموں کی قوم تھی۔ اس کا ہر فرد کسی نہ کسی طرح مجرم تھا۔ کسی نہ کسی کا مجرم تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اربوں روپے کا سونا غلہ اور دوسری اشد ضروریات کی چیزیں سرحد کے اس پار پہنچ گئیں۔

حکام ہی نہیں تقریباً پچھتر فی صدی پولیس بھی مجرموں سے ملی

ہوئی تھی۔ روزنا اخبارات میں خبریں آتی تھیں کہ آج اتنے لاکھ کا سونا پکڑا گیا مگر اسمگلر بچ نکلے۔ کیوں؟ پولیس کی مدد سے۔ دوسرے روز پھر اتنا ہی سونا پکڑا گیا مگر سونا لانے اور لے جانے والے پھر بچ نکلے۔ غرض روزانہ کا یہی تماشا تھا۔

ملٹری اس تمام ابتری سے غافل نہ تھی مگر چونکہ اس نے ملک و حکومت کی وفاداری کا حلف لے رکھا تھا۔ اس لیے مداخلت کی ابھی روادار نہ تھی۔

جاوید نے تبادلہ کے سلسلہ میں دوسرے شہر میں پہنچ کر بھی کارہائے نمایاں انجام دیئے مگر جب دارالخلافہ میں ہر قسم کے جرائم حد سے زیادہ ہونے لگے تو اسے پھر واپس دارالخلافہ میں بلا لیا گیا۔ اس طرح وہ آٹھ دس ماہ بعد ہی واپس آگیا۔

یہاں آتے ہی اس نے بدمعاشوں اور تخریبی عناصر کو پھانسنے کے لئے پھر جال پھیلا دیا مگر اس جال میں چھوٹی اور بڑی مچھلیوں کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے مگرمچھ بھی پھنس گئے اور جال کو توڑ کر نکل گئے مگر جاوید نے ہمت نہ ہاری۔ کسی کی رو رعایت کئے بغیر اپنے فرض میں لگا رہا۔

اس نے انکم ٹیکس اور سیلز ٹیکس ادا نہ کرنے والے بڑے

بڑے مہاجنوں کی بھی نشان دہی کی مگر ٹیکس سے بچنے والوں کا پیسہ خود انکم ٹیکس کے افسروں کی جیب میں آ رہا تھا اس لئے ان لوگوں کا بال بیکا نہ ہوا۔

دو تین کیس تو جاوید نے معرکتہ الآرا پکڑے کہ یہ اسی کا کام تھا۔ اب اس کی اس عظیم کارگزاری کو بھی حکومت کے عمّال نظر انداز کرتے ہیں تو ان کی قلعی کھلتی ہے۔ یہ بات آشکارا ہوئے بغیر نہ رہتی کہ جنادری مجرموں سے خود حکومت ملی ہوئی ہے۔ لہذا ایسے مجرموں کو پکڑا ضرور مگر جلد ضمانت پر رہا کر دیئے گئے۔

اسی طرح اب حکومت جاوید کو بھی ترقی دینے پر مجبور ہو گئی۔ چنانچہ تبادلہ پر سے واپس آنے کے تین چار ماہ بعد ہی وہ سپرنٹنڈنٹ بنا دیا گیا۔ وہ اس سے بڑے عہدے کا سزاوار تھا۔

اس کے بعد ہی اسے صفیہ بار دیگر یاد آئی۔ یہ تنہا نفس کا تقاضا نہ تھا بلکہ اپنے وقار کی بحالی کا معاملہ بھی تھا کیونکہ اپنے اپنے پیغام کے سلسلہ میں اس نے صفیہ کو تحریر کیا تھا کہ وہ ترقی پانے والا ہے مگر اسے نہ تو ترقی ملی تھی نہ کچھ بلکہ اس کا الٹا تبادلہ کر دیا گیا تھا۔

ان تمام حالات سے صفیہ بے خبر تھی۔ جاوید کی ترقی کی اطلاع

چونکہ غلط ہو گئی تھی۔ اس وجہ سے وہ پہلے صفیہ سے اس کی خاموشی کے باوجود رجوع کرنے سے شرمایا تھا مگر اب اسے واقعی ترقی مل گئی تھی۔ اسی بناء پر صفیہ کے بھی مل جانے کی امید باندھنے لگا تھا۔

آخر ایک روز فرید کو بلا کر جاوید نے کہا۔

فرید! یہاں سے میری اس آٹھ دس ماہ کی غیر حاضری کے زمانے میں صفیہ کے ہاں جانے کا تو تمہیں کیا اتفاق ہوا ہو گا۔

فرید نے جواب دیا۔

نہیں ماموں! اوّل تو مجھے فرصت نہیں ملی۔ دوسری بات یہ تھی کہ بلا وجہ کیسے جاتا۔

جاوید بولا۔

خدا جانے ان لوگوں کا کیا حال ہے؟ اماں کو بھی وہاں نہیں بھیج سکتا۔ اگر تمہیں وقت مل جائے تو کل ہو آئیے۔

فرید نے کہا۔

دیکھئے! کوشش کروں گا۔

صفیہ کے ہاں جانے میں فرید اپنے لئے بھی تو وجہ مسرت

دیکھتا تھا مگر جس طرح جاوید اپنے پچھلے حالات کی بنا پر صفیہ سے رجوع کرنے میں خفت سی محسوس کر چکا تھا۔ اسی طرح شمی کو دیکھنے کی حسرت بھی فرید اپنی عدیم الفرصتی کی نذر کر چکا تھا۔

آپ کیوں آئے ہیں؟

فرید نے دروازہ کھٹکھٹایا تو شمی نے باہر نکل کر دریافت کیا۔ اس نے فرید کو پہچان لیا تھا۔ اسی وجہ سے رکھائی کے ساتھ مخاطب ہوئی تھی۔

فرید نے جواب دیا۔

مجھے جاوید ماموں نے آپ لوگوں کی خیریت معلوم کرنے بھیجا ہے۔

شمی بولی۔

کون جاوید ماموں؟

فرید دیکھ رہا تھا کہ اس عرصہ میں شمی جوان ہو گئی تھی اور پہلے سے بھی زیادہ اچھی نظر آ رہی تھی۔

شمی نے اس کے متوحش اشتیاق سے قدرے چڑ کر کہا۔

کیا دیکھ رہے ہیں آپ جواب کیوں نہیں دیتے؟

فرید نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

معافی چاہتا ہوں۔ یہ دیکھ رہا تھا کہ آپ ماشاءاللہ جلد کافی بڑی نظر آنے لگیں۔

شمی نے کہا۔

آپ یہ کہنے والے کون ہوتے ہیں؟

فرید نے کہا۔

کوئی نہیں۔ فقط ایک دوست۔

شمی نے کہا۔

ہنہ! بڑے آئے دوست، دشمن نادوست!

اس کے سخت دل سے غریب فرید کے متعلق کدورت نہیں گئی تھی۔ وہ اب بھی اس بدگمانی میں مبتلا تھی کہ اس کے اغوا میں وہ بھی علیمہ کا شریک کار تھا۔

اس بار صفیہ نے باہر نکل کر کہا اور فرید کو پہچان کر بولی۔

کسے ڈانٹ رہی ہو شمی؟

اوہو فرید میاں! آج کدھر بول پڑے۔

فرید نے جواب دیا۔
پہلے کی طرح اس بار بھی جاوید ماموں نے مجھے آپ کی خیریت دریافت کرنے بھیجا ہے۔
صفیہ کا لہجہ نامعلوم کیوں تیکھا سا ہو گیا مگر پھر فوراً بات پلٹ کر بولی۔
خوب! کیا جاوید صاحب بقید حیات ہیں؟
آؤ اندر آؤ۔
فرید اس کے ساتھ اندر چلا گیا۔ شمی بھی آ گئی۔
صفیہ نے کہا۔
بیٹھو! آج کل تو ماشاء اللہ اخبارات میں تمہارے ایثار و خدمتِ خلق کے بہت تذکرے آ رہے ہیں۔
فرید نے کہا۔
اس میں میرا قصور نہیں ہے۔
شمی بدمزگی سے درمیان میں بولی۔
ہاں قصور اخبار والوں کا ہے کہ وہ ایک غلط آدمی کو اچھال رہے ہیں۔
فرید مسکرا کر بولا۔

آپ نے سچ فرمایا۔

عفیفہ اپنی لڑکی سے بولی۔

نہیں شمی! ایسی بات نہ کہو۔

اس نے فرید کی تواضع چائے بسکٹ وغیرہ سے کی۔ تھوڑی دیر بعد وہ چلا آیا۔

جیسے عمر کے ساتھ ساتھ سماجی تخریب میں اپنے باپ سے بڑھتا جا رہا تھا۔ اصل تو اس کا والد ہی ملک کی تباہی کے لیے کافی تھا۔ پھر اس کی سیاہ جماعت اور ویسے ہی بے شمار افراد نے مل کر قوم کو غارت کر کے رکھ دیا تھا۔ خود قوم ہی وحشی بن گئی تھی بلکہ یہ حکومت بھی وحشیوں اور مردم خوروں کی تھی۔

گنجے کی گرفتاری کے بعد پولیس اس سے کچھ قبول نہ کرا سکی۔ تمام الزام اس نے مفرور نعرو ہی کے سپرد رکھا۔ اسی کو صفیہ کے

شوہر کا قاتل بنایا۔ خود کو اور جاوید کی گولی سے ہلاک ہونے والے عبدل کو صرف شریکِ جرم ظاہر کیا۔

مگر جاوید کو اس کے بیان کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ گنجا اپنے پیشہ کے اعتبار سے اور عبدل اپنی بدچلنی کے باعث کسی عورت کا اغوا تو کر سکتے تھے مگر وہ عورت صفیہ کی عمر والی نہیں ہو سکتی تھی بلکہ کوئی نوجوان ہوتی یا اس میں یہ خصوصیت ہوتی کہ اس کا تعلق کسی دولت مند گھرانے سے ہوتا۔

لیکن ساتھ ہی جاوید یہ بھی سوچتا تھا کہ اگر گنجے، عبدل اور مفرور نصرو کے علاوہ اس جرم میں کوئی تیسرا شخص یا پارٹی بھی شریک ہی تو اس پارٹی نے صفیہ ہی کو کیوں تاکا تھا۔ صفیہ حسین ضرور تھی مگر نوعمر نہ تھی۔

اس گتھی کو جاوید حل نہ کر سکا۔ شاید کوئی سراغ رساں بھی بمشکل حل کر سکتا تھا۔ کیونکہ صفیہ کا اغوا غلام بہادر کریم کی سرمستی کی محض ایک ترنگ تھی جس میں گنجے اور عبدل نے رنگ بھر دیا تھا ورنہ ممکن تھا کہ کریم اپنی ہوس کاری کے لئے کسی زیادہ اچھی عورت کا انتخاب کرتا۔

یہ معمہ حل نہیں ہو رہا تھا۔ اس لئے پولیس نصرو کی تلاش میں

مصروف ہو گئی۔ اس کے ذریعہ ممکن تھا کہ جرم کی اصل کڑی ہاتھ آ جاتی۔ اس طرح نصرت کے سراغ میں مبتلا ہو کر پولیس اصل مجرم کی تلاش کے سلسلہ میں بھٹک گئی۔

جاوید کے دل میں چند بار یہ خیال بھی آیا کہ حنیفہ سے مل کر دریافت کیوں نہ کرے کہ آیا اس کا کسی پر شبہ ہے لیکن یہ کوشش وہ پہلے ہی کر چکا تھا اور اس باب میں حنیفہ اس کی کوئی مدد کرنے سے قاصر رہ گئی تھی۔

وہ غریب اپنے اغوا کے عقب والے اسرار سے خود لاعلم تھی۔ البتہ شمی کے اغوا کرنے کی جو کوشش عبید نے کی تھی اور اس جرم میں سزایاب ہونے کے بجائے وہ بچ نکلا تو اس کے بچ جانے کے ذرائع کو تلاش کرنے کی اگر جاوید کوشش کرتا تو ممکن تھا کہ بہت کچھ چھان بین کے بعد تخریبی عنصر عبید کے باپ کریم کی تخریبی کارروائیوں کا کوئی سراغ اس کے ہاتھ آ جاتا۔

جاوید و حنیفہ کے معاملات چونکہ عاشقانہ نہ تھے بلکہ عاقلانہ تھے، اس لئے ان میں دیوانگی، سرگرمی اور بے تابی شامل نہ تھی۔ پھر بھی حنیفہ عورت کی حیثیت سے جاوید کی درخواست کو مسرت

سے دل ہی لئے بیٹھی تھی ۔

صفیہ اپنی خوبروئی و نیک کرداری کی بناء پر بیوگی کے بعد دوسری جگہ سے آنے والے پیغامات سے خالی نہ رہی۔

جاوید کی غیر حاضری و طویل خاموشی سے مایوس ہو کر اس نے ایک بڑے تاجر کے پیغام کی پذیرائی کا نیم ارادہ بھی کر لیا تھا کہ عین ان ہی دنوں میں جاوید کا فرستادہ فرید مزاج پرسی کے لئے صفیہ کے پاس آ ٹپکا اور اس کے نیم ارادہ کو متزلزل کر گیا۔

فرید کے چلے جانے کے بعد صفیہ سوچ رہی تھی۔

جب انہیں میرا کوئی خیال نہیں ہے تو مزاج پرسی کیوں کیا کرتے ہیں۔

آخر انہیں جھجک کیا ہے۔ یہ جھجک نہ ان کی عمر کے شایاں ہے نہ میری عمر کے۔

ایک روز شمی نے صفیہ سے کہا۔

جاوید صاحب پرسوں اپنے مکان کی طرف سے نکلے تھے امی!

صفیہ نے قدرے حیرت و مسرت سے پوچھا۔

اچھا! تم کہاں تھیں؟

شمی نے کہا۔
میں اسکول سے آرہی تھی کہ اپنے سامنے والی سڑک پر سے ان کی جیپ گزری تھی۔
حنیفہ نے کہا۔
خیر یہ پولیس والے ہیں۔ ان کا کام ہی شہر میں گشت لگانا ہے۔
شمی بولی۔
میں نے چاہا تھا کہ انہیں روک کر چائے کی دعوت دوں۔
حنیفہ مسکرانے لگی۔
اپنی والدہ کے پاس جاوید کا پیام آنے کے حال سے شمی واقف تھی۔ کیونکہ اس موضوع پر دونوں ماں بیٹی کی گفتگو ہوئی تھی۔ شمی بظاہر اس پیام سے ناخوش نظر نہیں آتی تھی مگر عام بالغ اولاد کی طرح جن کے بیوہ یا رنڈے والدین نکاح ثانی کیا کرتے ہیں۔ شمی نے بھی اپنی والدہ کے پاس آئے ہوئے جاوید کے پیام کی دل میں پذیرائی نہیں کی تھی بلکہ اپنی قدرے انانیت پسند طبیعت کی بنا پر اس خیال کی ایک ہلکی سی لہری اس کے دل میں پیدا ہوئی تھی کہ اس کی والدہ اپنے پیغامات کی شائق ہونے کے بجائے

اس کی دلبستگی کی (فکر کیوں نہیں کرتی۔

اس خیال میں شمی کی انانیت کو حقیقتاً دخل نہ تھا بلکہ اس کی مقتضی اس کی اپنی اٹھتی جوانی تھی جو ہر چند محتاط و پاکباز تھی مگر ریعان شباب آخر اپنے تقاضے رکھتا ہے۔ شمی چاہتی تھی (ابھی آرزومند نہیں ہوئی تھی) کہ اس کی والدہ پہلے اس کا (شمی کا) گھر بسائے بعد کو اپنی فکر کرے۔

اور جب جاوید (پچھلے ابواب میں بیان کردہ ترقی نہ پانے کی خجالت کی بناء پر) آٹھ دس ماہ تک گم رہا اور اس نے صفیہ سے بارِ دیگر رجوع نہ کیا تو شمی کو ایک طرح اطمینان ہوا تھا۔
شمی اپنی گریز کی عادت کی بناء پر خود کسی لڑکے کو پسند نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس مسئلہ کو ایک حد تک اس نے اپنی والدہ پر رکھ چھوڑا تھا مگر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اور جوانی اُمنڈی آتی چلی گئی۔ شمی اپنے اندر ایک خلش سی پانے لگی تھی۔
اسی خلش کی حالت میں ایک سرد رات اور لطیف فضا کے زیرِ اثر دفعتاً اس کے دل میں ایک خیال کوندا۔ ناپاک و ناجائز خیال نہیں بلکہ خلش کو رفع کرنے والا خیال۔ یہ کہ جاوید اگر اس کی والدہ کو قبول نہیں کرتا تو ان کی جگہ وہ خود کو رکھنے کے لئے تیار ہے۔

23/9/63

اس طرح پہلی بار ششی کے خیال میں جاوید کے متعلق ایک جذبہ پیدا ہُوا۔ اگرچہ یہ جذبہ بے محابہ نہ تھا مگر تحریک ضرور تھی۔ اس نے سوچا کہ اس کا سوتیلا والد بننے کے بجائے اگر اس کا اپنا جنم ساتھی بن جائے تو یہ معاملہ زیادہ خوش آئند رہے گا۔

ششی کی یہ باغی تحریک اپنی ماں کے خلاف کسی بدخواہی یا جلن پر مبنی نہ تھی بلکہ عمر اپنے تقاضا کی بناء پر یہ چیز طلب کر رہی تھی۔ اس لئے اس نے جاوید کی طلبگار ہی ہونا پسند کیا تھا۔

اور اسی نئی طلب کے زیر اثر اس نے جاوید کو اپنے مکان کے سامنے سے گزرتا دیکھ کر ناوانستہ چاہا تھا کہ اسے روکے اور چائے کی دعوت دے مگر شاید احتیاط یا کسی اور چیز نے اسے روک دیا۔

گلِ رشمی دیکھتی تھی کہ اکثر اس کی والدہ کو جاوید یا اس کی والدہ کا انتظار رہنے لگا تھا۔ اس انتظار کو ممکن ہے جاوید کے باب میں اپنی والدہ کی شفقت پر محمول نہ کیا ہو بلکہ صرف لپسندہی سمجھا ہو مگر رشمی کا دماغ اس حقیقت تک شاید نہ پینچ سکا تھا کہ وہ نہ اپنی اور اپنی لڑکی کی حیاتِ آئندہ کے لئے ایک جائز نگران کی خواہاں تھی اور اسے جاوید سے زیادہ صالح شخص اپنے دوسرے پیغام بھیجنے والوں میں نظر نہ آیا تھا۔

جاوید اپنے بڑے عہدے اور نئی ذمہ داریوں میں برائے

چندے اس قدر الجھنیں گیا تھا کہ حنیفہ سے بارِ دیگر رجوع کرنے کا وقت نہ نکال سکا۔ منجملہ دوسرے نئے اور پرانے جرائم کی تحقیق و تفتیش کے اس کے دل کو اب حنیفہ کے شوہر کے قتل کا راز اور اس کا خود کا اغوا جھنجوڑتا رہتا تھا۔

وہ وقت نکال کر اس فکر میں رہنے لگا کہ گنجے کے کسی مربی (اگر اس کا کوئی مربی تھا) سراغ لگائے۔ لفر اب تک مفرور تھا۔ اس لئے جاوید کو راز تک اُترنے میں کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔

آخر اسے پھر فریدی کا خیال آیا۔ یہ خیال یوں آیا کہ مشرف مرحوم کے گھرانے کی دو عورتیں ماں اور بیٹی یکے بعد دیگرے اغوا کی گئی تھیں۔ بیٹی کا اغوا کنندہ پکڑا گیا تھا۔ ماں کے اغوا کنندگان میں سے ایک مارا جا چکا تھا۔ ایک جیل میں تھا اور ایک مفرور تھا اس لئے معاملہ کا کوئی صحیح سراغ ہاتھ نہیں آرہا تھا۔

اچھا تو بیٹی کے اغوا کے کیس پر روشنی ڈالنی چاہیئے۔ جاوید نے سوچا۔ اس کیس سے چونکہ فریدی بھی اس کے (جاوید کے) مقابلہ میں شاید زیادہ باخبر تھا۔ چنانچہ اس نے بارِ دیگر فریدی سے کرید کرنا شروع کی۔

اس نے پھر فرید سے تقریباً وہی سوالات کئے جو پہلے کر چکا تھا مگر بیچارہ فرید اسے عبید کی ابتدائی ہسٹری اور اس کے بعد وفعتہً بربنائے خباثت اس کا کشتی کو اڑانے کا فیصلہ کرنا وغیرہ اس سے زیادہ کچھ نہ بتا سکا۔

میں صفیہ دشمنی ہی سے کوئی تفصیل کیوں نہ دریافت کر لوں۔ مگر اپنے اغوا کے بارے میں جو کچھ تفصیل تھی وہ صفیہ پہلے ہی جاوید کو سنا چکی تھی۔ اب باقی رہ گئی تھی۔ اسی سے عبید کی نیت وغیرہ کے بارے میں کچھ دریافت کرنا چاہیئے۔ شاید اس طرح صفیہ کے واقع پر اس سے کسی قدر روشنی پڑ سکے۔

یہ سوچ کر جاوید سادہ لباس میں ایک شام کو تنہا صفیہ کے مکان پر پہنچا۔ ہر چند وہ یہاں ڈیوٹی پر آیا تھا مگر یہ مکان وہ تھا جس میں صفیہ رہتی تھی اور صفیہ وہ تھی جسے جاوید اپنی زندگی کی شریک بنانے کا متمنی تھا اس لیے صفیہ کے مکان تک پہنچتے پہنچتے جاوید کے دل و دماغ پر ادائے فرض کے ساتھ صفیہ بھی موجود تھی۔

صفیہ نے اب تک بستی کے لیے اپنے ہاں محلہ کے ایک بوڑھے جوڑے کو رکھ رکھا تھا۔ ایک اجنبی کو برآمدے میں دیکھ

کہ ان لوگوں نے ڈیرا کا۔

جاوید نے بڑے میاں سے کہا۔

اگر صفیہ صاحبہ اندر ہوں تو ان کو اطلاع کر دیجئے کہ جاوید آیا ہے۔

چنانچہ وہ اندر گئے۔

جاوید کی آمد کی اطلاع سے گھر کے اندر کی خاموش فضا ایک دم جاگ پڑی اور اس کے استقبال کو سب سے پہلے شمی دوڑ کر باہر آ گئی۔

شمی نے کہا۔

سلام علیکم جاوید صاحب! آپ کمرے میں آ جائیے امی ذرا نہا رہی ہیں۔

جاوید مسکرا کر بولا۔

شکریہ!

اور کمرے میں آ گیا۔

جاوید نے مسکرا کر کہا۔

میری وجہ سے کوئی خلل تو واقع نہیں ہوا۔ بغیر اطلاع دیئے آ گیا ہوں۔

شمی نے مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

مطلق نہیں بلکہ مسرت ہوئی تشریف رکھئے نہ۔

جاوید بیٹھ گیا ۔شمی بھی ایک کرسی گھسیٹ کر ٹک گئی۔

جاوید نے دریافت کیا۔

تمہارے امتحانات ہو گئے شمی بیٹی ؟

اچھا تو یہ میرے ابا جان بننے کا تہیہ ہی کر چکے ہیں۔ خیر شمی نے ایک لمحہ کے لئے ذرا دکھ سے سوچا۔ پھر مسکرا کر بولی۔

شمی نے جواب دیا۔

جی ہاں شکر ہے میں میٹرک میں کامیاب ہو گئی اور فسٹ ایر میں میں نے داخلہ لے لیا ہے۔

جاوید نے مزاحاً کہا۔

خوب ! تو گویا آج کل فرسٹ ایر فول ہو۔

شمی نے برا نہیں مانا مسکرانے لگی۔

جاوید نے مقصد کی طرف فوراً آتے ہوئے مسکرا کر دریافت کیا۔

اب تو کوئی بیہودہ لڑکا تمہارا سدِ راہ نہیں ہوتا ؟

جی ۔ ۔ ۔ ۔ جی نہیں !

ششی نے رکتے ہوئے جواب دیا کیونکہ اب بھی چند بدتمیز لڑکوں کو ادھر ادھر دیکھتی تھی۔

جاوید نے اس کی ہچکچاہٹ تاڑتے ہوئے کہا۔

خیر فکر نہ کرو۔ اب میں یہاں آگیا ہوں۔

ششی خاموش ہو گئی۔

جاوید نے عبید کا ذکر چھیڑتے ہوئے دریافت کیا۔

پھر کبھی تمہیں وہ بدمعاش لڑکا عبید راہ میں نہیں ملا؟

ششی نے جواب دیا۔

جی نہیں۔ اس روز کے بعد سے میں نے اس کی منحوس صورت نہیں دیکھی۔

جاوید نے تحقیق کی ابتدا کی۔

آخر وہ ایسی حرکت کیسے کر گزرا تھا ششی؟

ششی نے کہا۔

یہ اس کی ذلیل فطرت کا مظاہرہ تھا۔

کیا تم اپنے واقعہ پر کسی قدر روشنی ڈالنا پسند نہیں کرو گی؟

ششی نے کہا۔

واقعہ سے چند روز پہلے وہ ہمارے ہاں ایک دو دفعہ آیا
آیا تھا۔ پھر جب کسی نے اسے منہ نہ لگایا تو مجھے کبھی گلی کے
قریب اور کبھی سامنے والی سڑک پر ملنے لگا تھا۔

جاوید نے کہا۔

میں ابتدا سے سننا چاہتا ہوں۔

شمی نے کسی قدر تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا۔

پوری تفصیل تو امی کو معلوم ہے۔ ان کی زبانی اتنا میرے علم میں آیا تھا کہ ایک روز نمائش میں امی کے پاس سے کچھ نوٹ غائب ہو گئے تھے اور امی کا شبہ عبید پر گیا تھا کیونکہ وہ ان کے پاس آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ بہر حال تھوڑی بعد اس پر سے امی کا شبہ زائل ہو گیا اور وہ واپسی میں اس کے اسٹال کی طرف نکل گئی تھیں جہاں اس نے امی کے نقصان کی تلافی کے حیلہ میں انہیں تیس چالیس روپے قرض دیئے تھے کیونکہ انہیں چند ضروری چیزیں خریدنا تھیں اس کے روپے ادا کرنے کو امی اس کو اپنے مکان پر لے آئی تھیں۔ یہاں آنے کے بعد وہ مجھے دیکھنے لگا تھا۔ پھر جب کبھی آتا میری طرف دیکھنے لگتا تھا۔

جاوید سنتا رہا اور دماغ پر زور دیتا رہا مگر اصل واقعہ کا کوئی سراغ

اس کے ہاتھ اب بھی نہ آیا۔ صرف اتنا اندازہ لگا سکا کہ عبید نے صفیہ کے مکان کے جو ایک دو چکر لگائے تھے وہ اس کی خاطر نہ تھے بلکہ شمی کی خاطر تھے۔

آخر دس پندرہ منٹ بعد صفیہ غسل خانے سے نکل آئی اور جاوید کو بیٹھا ہوا پا کر سامنے آنے کی جرأت نہیں کی بلکہ پاس والے کمرے میں چلی گئی۔

مگر صفیہ دل میں بہت خوش تھی۔ آخر جاوید اس کے مکان پر آیا تو۔

صفیہ نے دوسرے کمرے میں سے کہا۔

شمی! تم نے جاوید صاحب کو چائے نہیں پلائی۔ صرف باتوں میں ٹالتی رہیں۔

شمی نے کہا۔

میں نے بڑی بی سے کہہ تو دیا تھا۔ ابھی لائی امّی!

جاوید مسکرا کر بولا۔

ششی کو میں نے روک لیا تھا اور ریڈیو کی بجائے ان کی باتیں سن رہا تھا۔

ششی کے چلے جانے کے ایک دو منٹ تک خاموشی رہی آخر صفیہ ہی نے مہمان نوازی کے طور پر گفتگو کی ابتدا کی۔

اس نے پوچھا۔

آپ کی والدہ صاحبہ نہیں آئیں؟

جاوید نے مسکرا کر جواب دیا۔

ان کا مشن پورا کرنے اب کی دفعہ میں ہی چلا آیا۔

صفیہ دوسرے کمرے میں ہونے کے باوجود شرمائے بغیر نہ رہی۔

جاوید نے کہا۔

ششی میری درخواست پر ابھی اپنے اغوا کا واقعہ سنا رہی تھیں مگر ان کے واقعہ کا تعلق میں آپ کے واقعہ سے قائم کرنے میں اب تک کامیاب نہیں ہو سکا ہوں۔

صفیہ بولی۔

کیونکہ ہم دونوں کے واقعات علیحدہ علیحدہ ہیں۔

جاوید نے کہا۔

لیکن وہ مجھے بعض اوقات کچھ یکساں سے معلوم ہونے لگتے ہیں۔

صفیہ نے مزاحاً کہا۔

یہ آپ کی پولیس والی آدروہ ہے۔

جاوید بھی مسکرانے لگا۔

جاوید نے کہا۔

مشکل یہ ہے کہ اپنے واقعہ کی ابتدا و آپ کے علم میں مطلق نہ آسکی تھی۔ میں کافی غور کرچکا ہوں لیکن اب تک کچھ سمجھ میں نہیں آیا ہے۔

صفیہ نے کہا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

آپ نے اس تفتیش کے لئے زحمت کی ہوگی آج۔

جاوید نے کہا۔

آپ کے اس سوال کا جواب ہے ذرا مشکل کیونکہ تفتیش کی نیت سے انکار کرتا ہوں تو فرض سے علیحدہ ہوتا ہوں اور اگر محض تفتیش ہی سے چمٹا رہتا ہوں تو میرا مدعا کمزور ہوتا ہے۔

صفیہ خاموش ہوگئی۔

جاوید بولا۔

آپ نے سوال نہیں کیا کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ماجرا کیا ہے ؟

اب بھی صفیہ کچھ نہ بولی ۔

جاوید نے دریافت کیا ۔

خیر مجھے خود ہی ظاہر کرنا پڑے گا ۔ اچھا یہ تو بتائیے کہ کسی کے واقعہ سے قبل کیا آپ نے سڑک یا گلی کے نکڑ پر کبھی کسی دوسرے آدمی کو بھی دیکھا تھا ؟

جی نہیں ۔

صفیہ نے جواب دیا مگر پھر دفعتہً بولی ۔

ٹھہرئیے ! آپ کے دریافت کرنے پر یاد آیا کہ میرے اغوا کے سلسلہ میں اس رات کو جس گنجے سے شخص کے ہاتھ پر آپ کی گولی لگی تھی ، اسے میں نے ایک بار سڑک پر ٹرک سے جاتے ہوئے دیکھا تھا اور سڑک روک کر وہ عبید سے باتیں کر رہا تھا ۔

صفیہ کے ان الفاظ سے جاوید کچھ چونک سا گیا ۔

اس نے ذرا کھوئے ہوئے انداز میں کہا ۔

آج قبولا ہے یہ آپ نے ۔

صفیہ نے کہا ۔

لیجئے ! اس میں غضب کون سا ہو گیا ۔

جاوید نے کہا۔

غضب تو ہو گیا تھا۔ آپ نے آج تک نہیں بتایا کہ ان نیفل مجرموں میں سے ایک کو اتفاقیہ آپ ایک دفعہ دیکھ چکی ہیں۔

صفیہ بولی۔

سچ ہے۔ یہ چیز میرے حافظہ سے بالکل ہی اتر گئی تھی۔

جاوید نے مسکرا کر کہا۔

یہ تو اچھی عادت نہیں۔ آپ کے اس حافظہ کی بدولت جاوید نامی ایک شخص کا نہ معلوم کیا حشر ہوگا۔

صفیہ پھر شرمسارانہ خاموش ہو گئی۔

جاوید نے کہا۔

اگر گنجا حبس کا نام رزاق ہے عبید سے واقف ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ عبید کے ہاں ستی کے اغوا کا ذکر ہوا ہو گا اور کیا عجیب ہے کہ عبید ہی کے مکان سے آپ کے اغوا کی سازش اٹھی ہو۔

صفیہ نے کہا۔

آپ بہت دور کی کوڑی لائے ہیں مگر آپ کے شبہ کی تردید

کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

جاوید بیٹھا ہوا کچھ سوچ رہا تھا۔

صفیہ نے اسے چپ پا کر پوچھا۔

لیکن جاوید صاحب! آخر عبید کے مکان پر کون سا میرے خلاف سازش کر سکتا تھا اور کیوں؟

جاوید نے جواب دیا۔

اس کے متعلق ابھی میں بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میری تھیوری بہت غور و خوض چاہتی ہے۔

صفیہ پھر خاموش ہو گئی۔

ایک دو منٹ بعد جاوید نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

اچھا! اب میں اجازت چاہتا ہوں۔

صفیہ نے کہا اور کمرے سے نکل کر باورچی خانہ میں چلی گئی۔

واہ! چائے آ رہی ہے بیٹھئے! استمی اور بڑی بی جا کر باورچی خانہ میں بیٹھ رہی ہیں۔ براہ کرم ذرا رک جائیے۔

چند منٹ بعد چائے آ گئی۔ بازار سے مٹھائی وغیرہ کے انتظار میں چائے میں دیر ہو گئی تھی۔ کچھ دیر کی وجہ یہ بھی تھی کہ ممی تو یہاں ابا لے بیٹھ گئی۔

جاوید نے سوّئیاں دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔
ادہو اب کی دفعہ بغیر رمضان کے عید آگئی۔
شمی نے چھوٹی میز پر سب چیزیں چنتے ہوئے کہا۔
انہی کی وجہ سے ذرا دیر ہوگئی تھی معاف کیجئے۔
جاوید نے کہا۔
لیکن آپ نے اتنا لمبا اہتمام کیوں کر ڈالا۔ یہ تو کئی روز کا آب و دانہ ہو گیا۔
صفیہ دوسرے کمرے میں سے بولی۔
بہت معمولی سی چیزیں ہیں۔ بسم اللہ!
جاوید نے کہا۔
اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہاں اتنا کھانے پینے کو ملے گا تو اپنے ہمراہ فرید کو بھی لے آتا۔
صفیہ نے دریافت کیا۔
کیا فرید میاں کو مٹھائی مرغوب ہے؟
جاوید نے جواب دیا۔
پہلے وہ کھانے پہننے کا بڑا شائق تھا۔ اب تو اس نے اپنے تمام شوق مار لئے۔

فرید کے ذکر سے شمی اسکراہ محسوس کرنے لگی۔ اس کے باب میں شمی کی غلط فہمی اب تک برقرار تھی۔

صفیہ نے کہا۔

یہ واقعہ فرید کی وفعتہً کایا پلٹ سی کیا ہو گئی۔ سال بھر پہلے جب نمائش میں انہیں دیکھا تھا تو لباس وغیرہ سے درست نظر آتے تھے مگر اب جو ایک دو بار آئے تو کافی بدلے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

جاوید نے کہا۔

اب وہ بڑا صالح لڑکا ہے اور اس نے قومی و ملکی خدمات کی بڑی اچھی لائن پکڑی ہے۔ وطن کے نوجوانوں کو ایسا ہی ہونا چاہیئے۔

شمی حقارت سے سوچ رہی تھی۔

ضرور ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ جاوید صاحب کو کیا خبر کہ فرید بھی میرے اغوا میں عبید کا شریکِ کار تھا۔

جاوید جیسا آیا تھا ویسا ہی اٹھ کر چل دیا۔ اس نے صفیہ سے اپنی دائمی وابستگی کے سلسلہ میں لب تک نہ کھولے۔ وجہ یہ ہوئی کہ صفیہ نے گنجے کی شناخت کا آج ذکر کر کے اس کی اگلی تھیوری اور قیاس کے تانے بانے کو توڑ ڈالا تھا۔ اس کے بجائے اس کے سامنے ایک نیا جال پھیلا دیا تھا۔

تمام راستے جاوید اسی چیز پر غور کرتا رہا۔ عبید سے بھی گنجے کی شناسائی کا ثبوت فراہم ہونے کے بعد سے جاوید کے دل میں بار بار یہی خیال آتا تھا کہ ہو سکتا ہے عبید کے مکان میں صفیہ

کے اغوا کی سازش کی گئی ہو۔ یہ قیاس غلط بھی ہو سکتا تھا۔

ادھر جاوید کے چلے جانے کے بعد صفیہ بیٹھی سوچتی رہ گئی کہ وہ کیوں تو آیا تھا اور کیوں چلا گیا۔ ممکن ہے اب اسے کچھ تذبذب ہو گیا ہو۔ خیر دیر آید درست آید۔

جاوید پیدل چلا جا رہا تھا کہ سامنے سے دو نوجوان گزرے ان میں سے ایک نے اسے سلام کیا۔

جاوید نے اخلاقاً اختر سے کہا۔

اوہو! اختر ہیں۔ کہو بھئی کہاں ہو آج کل۔ بہت دن بعد نظر آئے۔

پہلے کبھی وہ فرید کے پاس آتا جاتا رہتا تھا تو جاوید اسے دیکھتا رہتا تھا۔

اختر نے جواب دیا۔

ایک فرم میں کام کر رہا ہوں جاوید صاحب۔

جاوید نے کہا۔

خوب! چلو بیٹھے سے بیگار بھلی۔ فرید سے یہ معلوم کر کے افسوس ہوا تھا کہ تم اس سال میٹرک میں رُک گئے تھے۔

اس کے الفاظ سے اختر جزبز سا ہونے لگا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا کہ اس کا ساتھی بول پڑا۔

ہماری فرم میں نان میٹرک کو تو رکھا ہی نہیں جاتا۔ رحمان تو میٹرک پاس ہیں۔

جاوید نے کہا۔

کون رحمان؟

اختر کے ساتھی نے کہا۔

اوہو! آپ بھی صرف ان کا تخلص ہی جانتے ہیں۔ اصلی نام سے واقف نہیں۔

اختر اور بھی سراسیمہ نظر آنے لگا۔

جاوید مسکرا کر بولا۔

تو سمجھتا ہوں کہ ان کا نام اور تخلص ایک ہی ہے۔ خیر یہ اب شاعر بن گئے ہوں گے۔

آخر اختر نے جلدی سے موضوع بدل دیا۔

فرید ہیں تو بخیریت جاوید صاحب۔ اتوار کو آؤں گا ان سے ملنے۔ کیا وہ اب آپ کے مکان پر آکر رہنے لگ گئے ہیں؟

جاوید نے کہا اور روانہ ہو گیا۔

نہیں اپنے ہی مکان میں رہتے ہیں۔ میرے پاس آتے ہی رہتے ہیں۔ اچھا میاں اختر پھر ملاقات ہو گی۔

وہ آج چونکہ وردی میں نہ تھا تو آزادی سے پھر رہا تھا۔ اپنی مختصر گشت میں اس نے شہریت کی پامالی کے عجیب عجیب تماشے دیکھے۔ کسی نے مکان سے نکل کر عین شاہراہ پر گندہ پانی پھیلا دیا ہے تو کسی نے پان کھا کر جہاں چاہا پیک کی کلی کر دی ہے۔

کوئی راہ گیر چلتے چلتے ذرا سی بات پر دوسرے راہ گیر سے لڑ پڑا ہے۔ بات بڑھی کچھ لوگ ایک کے طرفدار ہو گئے۔ کچھ دوسرے کے اور تو تو میں میں کے بعد ہاتا پائی کی نوبت پہنچ گئی ہے۔

کوئی فٹ پاتھ پر بائیسکل لئے کھڑا ہے۔ تین چار دوست عین سڑک کے نکڑ کے پر راستہ روک کر کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔ کوئی عورت قریب سے گزرتی ہے تو ان میں سے ایک دو ٹڈھ کر اس کے بدن سے اپنا جسم مس کرتے ہوئے ادھر ادھر ہو جاتے ہیں۔

چند لوگ سڑک کے کناروں پر لگی ہوئی لوہے کی ریلنگ سے جھوم رہے ہیں۔ اسے بڑھا کر کے اکھاڑ چکے ہیں۔ کسی

نے ٹریفک کے انتباہ کے لوہے کے تختوں کو سرنگوں کر دیا کسی نے ٹیلیفون کے بوتھ کا دروازہ پار کر دیا ہے۔ کسی نے اس کے اندر اپنا بستر بوریہ لا ڈالا ہے یا تقریباً پتھر بھر دیئے اور ریسیور وغیرہ نوچ کر کوئی لیئے چلا جا رہا ہے۔

بس آئی ہے تو سوار ہونے کی کوشش کرنے والی عورتوں کو کنڈکٹر اور ڈرائیور بری بری گالیاں دے رہے ہیں۔ لوگ ہیں کہ بچوں اور دوسرے مسافروں کے پیروں کو کچلتے، سروں پر زوردار کہنیاں مارتے ہوئے بس میں گھسے پڑ رہے ہیں۔ کسی کی زبان پر لفظ معذرت تک نہیں۔ سپاہی موجود ہیں مگر ڈیوٹی پر پان کھا رہے ہیں۔ سگریٹ اڑا رہے ہیں اور اپنے یار دوستوں سے ہنسی مذاق میں دھول دھپا کر رہے ہیں۔

یہاں سے آگے بڑھا تو فٹ پاتھ پر اس نے اسکول کی دو تین معصوم صورت لڑکیوں اور برقع پوش خواتین کو چھ سات غنڈوں کے درمیان گھرا ہوا دیکھا۔ وہ انہیں چھیڑ رہے تھے بلکہ ایک دو لڑکیوں کے انھوں نے ہاتھ بھی پکڑ لیے تھے مگر لڑکیوں کی مدد کو نہ تو بے حس و بے غیرت پبلک میں سے کوئی بڑھا اور نہ سپاہی بلکہ لوگ کھڑے ہوئے اس طرح تماشا دیکھ رہے تھے۔

گویا کوئی تھیٹر ہو رہا تھا۔

حالانکہ سپاہی دور نہ تھا اور قریب ہی میں ٹریفک کا سارجنٹ بھی موجود تھا مگر اس ملامت آگیں منظر کو دیکھ کر اس کا پاسِ فرض بیدار ہوا اور نہ سپاہی کی رگِ حمیت جوش میں آئی۔

جاوید نے سارجنٹ کے پاس جا کر کہا۔

آپ اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھے ہوئے اس شرمناک منظر کو دیکھ رہے ہیں۔ کیا یہ آپ کے فرائض میں شامل نہیں ہے کہ غنڈوں سے خواتین کو بچائیں؟

سارجنٹ نے بیحیائی سے ہنس کر جواب دیا۔ سپاہی بھی ہنستا ہوا قریب آگیا۔

اپنا کیا لیتے ہیں اُڑانے دو مزے۔

جاوید نے کہا۔

مجھے آپ کا یہ جواب سن کر سخت تعجب بھی ہوا اور مایوسی بھی۔

اس نے ظاہر نہیں کیا کہ وہ بھی سپرنٹنڈنٹ پولیس ہے۔

سپاہی جاوید سے بولا۔

جا یار اپنا کام کر۔
جاوید نے کہا۔
سارجنٹ! میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ سپاہی کو لے کر جاؤ اور ان عورتوں کی مدد کرو۔
سارجنٹ نے ترشی سے کہا۔
تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہے معمولی سا آدمی اور ایک افسر کو حکم دینے چلا ہے۔
جاوید نے سکون سے کہا۔
انسان فرض میں کوتاہی کرتا ہے تو اسے نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ فرض کے بارے میں تمہاری یہ مجرمانہ غفلت تمہیں ملازمت سے ہاتھ دھونے پر مجبور کر دے۔
سارجنٹ خوب ہنسا۔ پھر جاوید کو ڈانٹ کر بولا۔
جا اپنا راستہ لے ورنہ بڑے گھر پہنچا دوں گا۔
جاوید نے کہا۔
ادھر آؤ۔
جب وہ پاس آیا تو جاوید نے جیب سے اپنا شناختی کارڈ نکال کر اسے دکھایا۔

شناختی کارڈ کو دیکھنے کے بعد سارجنٹ کا منہ فق ہو گیا۔ اس سے اور کچھ تو نہ بن پڑا عجلدی سے پیچھے ہٹ کر اس نے جاوید کو سلوٹ کیا اور سیٹی بجاتا ہوا غنڈوں کی طرف بھاگا۔

سپاہی کو ابھی معلوم نہیں ہوا تھا کہ جاوید کون ہے۔ اس نے بھی سارجنٹ کی تقلید میں سلوٹ اڑایا اور وہ بھی غنڈوں کے تعاقب میں روانہ ہوا۔

پولیس کی سیٹی سن کر بدمعاش بھاگ گئے اور عورتیں آزاد ہو گئیں۔ اس کے بعد سارجنٹ اور سپاہی عاجزی سے جاوید کے سامنے آکھڑے ہوئے۔

جاوید نے کہا اور روانہ ہوا۔

تم نے جو کچھ مجھے کہا ہے۔ اس کا میں نے کوئی خیال نہیں کیا چنانچہ تمہاری گستاخی کا مجھے کوئی انتقام نہیں لینا ہے لیکن فرض ادا کرنے میں جس افسوس ناک غفلت کا تم نے ثبوت دیا ہے۔ اس کی پاداش میں تم دونوں کو میں معطل کرتا ہوں۔ کل میرے آفس میں آؤ۔

سارجنٹ اور سپاہی خوشامدانہ اس کے پیچھے جانے لگے، مگر،

اس نے منع کر دیا۔

مجرموں اور قانون شکن لوگوں کی اس بستی میں یہ رات دن کے مناظر تھے۔ جاوید گھومتا پھرتا دوسری طرف نکل گیا مگر بس اسٹینڈ کے قریب ایک انبوہ کثیر کو جمع دیکھ کر وہ بھی وہاں پہنچا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک سپاہی کسی شخص کا اکیلا مقابلہ کر رہا ہے مجرم کے ہاتھ میں چاقو تھا اور سپاہی بالکل تنہا۔

یہاں بھی لوگ گرد کھڑے ہوئے اس طرح تماشا دیکھ رہے تھے۔ جیسے بازی گر کے کرتب دیکھ رہے ہوں بلکہ وہ مجرم کے حوصلے بڑھا رہے تھے۔ آس پاس کے دوکاندار بھی اپنی دوکانوں پر کھڑے ہو کر مجرم ہی کو شہ دے رہے تھے۔

یہ قانون کے خلاف لوگوں کی کھلی نفرت تھی۔ عیاں عناد تھا۔ سپاہی کی مدد کرنے کے بجائے سب مجرم کی مدد کر رہے تھے۔ پورا کا پورا مجمع مجرموں کا گروہ بن گیا تھا۔ گویا مجرم انہی کی برادری کا ایک فرد تھا۔

مقابلہ و مدافعت کرتے کرتے سپاہی قدرے زخمی ہو گیا تھا۔ جاوید کو جرم پسند و قانون شکن عوام پر بڑا ہی غصہ آیا۔ بہر حال اس نے لپک کر ایک دکان کے پردے کو سہارا دینے والی لوہے کی سلاخ

نوچ لی اور مجمع کو چیر کر اکھاڑے میں کود پڑا۔
جاوید نے ہانپتے ہوئے زخمی سپاہی سے کہا۔
تم ہٹ جاؤ۔ میں اس بدمعاش سے نپٹ لوں گا۔
سپاہی کے مددگار کو دیکھ کر مجرم جاوید کی طرف چاقو تان کر جھپٹا مگر جاوید نے اس کا وار خالی دے کر تیزی سے لوہے کی سلاخ مجرم کے ہاتھ پر ماری۔ مجرم کے ہاتھ سے چاقو گر گیا۔
اس کے بعد مجرم کو سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر جاوید چیتے کی طرح اس پر کودا اور اسے دبوچ لیا۔ مجرم کو مغلوب دیکھ کر لوگ اسے چھڑانے اور جاوید کو مارنے کے لئے بڑھے مگر جاوید چیخ کر بولا۔
خبردار! میرے قریب نہ آنا۔ میں سپرنٹنڈنٹ پولیس ہوں۔
اس کے یہ الفاظ سن کر سپاہی نے جلد جلد کئی بار سیٹی بجائی۔
سیٹی سے یہاں بھی لوگ منتشر ہونے لگے اور بہت سے دور جا کر تماشہ دیکھنے لگے۔
چند ہی لمحات کے بعد سیٹی کی آواز سن کر دو تین کانسٹیبل لپک کر آ گئے اور مجرم کو پکڑ لیا۔
جاوید نے سپاہی سے کہا۔
شاباش! تم نے بڑی بہادری کا ثبوت دیا۔ تمہیں ہیڈ کانسٹیبل

بنا دیا جائے گا۔

اس کے بعد وہ دوکانداروں سے مخاطب ہوا۔

آپ لوگوں نے انتہائی بزدلی اور قانون شکنی کا مظاہرہ کیا ہے۔ چنانچہ قانون کے محافظ کی مدد نہ کرنے کی پاداش میں سٹی مجسٹریٹ کے حکم سے آپ سب پر پچاس پچاس روپے جرمانہ کیا جائے گا۔

قانون کے باغی دو دکاندار بولے۔

مر گئے جرمانہ کرنے والے۔

ایک سب انسپکٹر نے کہا۔

یہ تم لوگوں کو آدھے گھنٹے میں معلوم ہو جائے گا کہ جرمانہ کرنے والے زندہ ہیں یا مر گئے۔

رفتہ رفتہ پولیس کی تعداد بڑھنے لگی تو دو دکانداروں نے اپنی دکانیں بند کرنا شروع کر دیں تاکہ کھسک جائیں مگر پولیس نے بڑھ کر انہیں روکا۔ اس پر مجمع ہی میں سے چند لوگوں نے مزاحمت کی چنانچہ ان کا بھی چالان کر دیا گیا اور دو دکاندار بھی گرفتار کر لئے گئے۔

بغیر سختی کے سرکش و بددیانت لوگ کبھی قابو میں نہیں آ سکتے۔

غرض جاوید کا صفیہ کے مکان پر جانا ایک طرح سے مبارک ہی ثابت ہوا کہ اس نے ایک دن میں لاقانون عوام کے مزاج درست کر دیئے۔ صفیہ سے تو وہ اپنے آنے کی غرض نہ کہہ سکا تھا مگر شریر عوام اس کے گشت لگانے کی غائت کو پا گئی تھی۔

عبید کے جرائم بھی بڑھتے ہی جا رہے تھے اور اب اس کے جرائم طفلانہ نہیں رہے تھے بلکہ قانون شکن تھے مگر اس سے کوئی سماجی تخریب نہیں ہوئی تھی۔

نمائش میں اس شب کو اس نے صفیہ کی چوری کے بعد

سے کئی جگہ اسی طرح ہاتھ صاف کیا تھا اور ان میں نمایاں ہستی کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔

مگر کیا وہ اغوا میں ناکام رہنے کے بعد سے قانون سے خائف ہو کر گھر میں گھس کر بیٹھ رہا تھا اور شریفانہ زندگی بسر کر رہا تھا؟ نہیں اب اس کی مجرمانہ جولانگاہ وسیع ہو گئی تھی اور جو کچھ جی میں آتا تھا کر گزرتا تھا۔ آخر وہ کس باپ کا بیٹا تھا۔

ان تمام باتوں کے باوجود بھی عبید پڑھنے میں پیچھے نہ رہا۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اساتذہ کی غفلت کی وجہ سے اسکولوں اور کالجوں کے طالب علم سخت بے اصولے اور اوباش ہو گئے ہیں۔ انہیں ہر تخریبی کام میں مزا آتا ہے اور تعمیری کاموں سے دور رہتے ہیں۔

عبید کا ایک تو خود گھرانا ہی سماج دشمن واقع ہوا تھا۔ دوسرے اس کی مذبوحی حرکات پر اسکول میں کوئی سرزنش تھی۔ یہی سبب تھا کہ وہ جھوٹ، دغا، فریب، بے ایمانی غرض پوری بے اصولی زندگی کا ہیرو تھا۔

اس کے برخلاف فرید اس قدر صالح نوجوان ہو گیا تھا کہ ہر اذیت رسیدہ شخص کے کام آتا تھا۔ اپنی جان پر مصیبت جھیلتا

اور دوسروں کو سکھ پہنچاتا۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ اس کی زندگی رفاہی کاموں کے لئے وقف تھی۔

فرید کی سرفروشانہ مساعی کے خلاف بہت سے ایسے افراد اٹھ کھڑے ہوئے تھے جن کا پیشہ ہی وطن دشمنی اور غداری تھا۔ اس محبِّ وطن نوجوان کے کارناموں سے جل کر وہ ہر وقت اس کے درپۂ آزار رہنے لگے۔ ان میں ایک عبید بھی تھا۔

جذبات خدمت اور پاس فرض کے ہجوم میں جاوید بھی باردیگر صفیہ سے رجوع کرنے کا وقت نکالنے سے قاصر رہ گیا تھا مگر صفیہ اب بھی اسی کے نام سے ملبھٹی ہوئی تھی۔ کیونکہ ایک تو پسند کا معاملہ آپڑا تھا۔ دوسرے اس کی خوبصورت لڑکی دفعتۃً جوان ہوگئی تھی اور اس کی جوانی کا کوئی نگران نہ تھا۔ تیسری بات یہ کہ خود صفیہ بے آسرا تھی۔

ہوشمند شمی کی نگاہ میں بھی یہ تمام باتیں اب آنے لگیں تھیں اور وہ سوچتی کہ جاوید اگر میرے نہیں تو میری والدہ ہی کے ہوجائیں۔ شروع میں شمی کے کچھ بھی خیالات تھے جو جلد جلد پلٹنے والے حالات اور واقعات کے ساتھ ساتھ بدل رہے تھے۔ چنانچہ

آج کل اس کے جذبات یہ تھے کہ جاوید صاحب امی ہی کا ہاتھ تھام لیں۔ اسے اب جاوید اپنے لئے موزوں نظر نہیں آ رہا تھا بلکہ اپنی والدہ کے لئے بہت مناسب دکھائی دے رہا تھا۔

آپ کی طویل خاموشی (جسے شرط کے مطابق میں کرم گسترانہ رضامندی سمجھتا ہوں) اب زیادہ برداشت نہیں ہوتی۔

آخر اس دفعہ جاوید نے صفیہ کو خط لکھا۔ آگے تحریر کیا تھا۔

اس بار میں اماں کے ہاتھ رقعہ روانہ کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اگلے ہفتے مع ساز و سامان کے آپ کے پاس آ رہی ہیں۔ اس کے ایک ہفتہ بعد قبلہ قاضی صاحب کو ساتھ لے کر حاضرِ خدمت ہوں گا۔ ایک قاضی بھی واقعی قاضی الحاجات ہوتا ہے۔

آپ کا یہ عذر نہیں سنا جائے گا کہ پندرہ روز کا نوٹس تو بہت کم ہے۔ پندرہ روز میں تو پندرہ ہزار دنیائیں آباد ہو سکتی ہیں۔ پھر میری دنیا کیوں نہیں آباد ہو سکتی۔

آپ کی ہر شرط بلا عذر قبول۔ خدا اور رسول ؐ کی تابعداری اور ملک و قوم سے وفاداری کے بعد تا بہ عمر

آپ کی غلامی منظور۔

بہر حال تیار ہو جائیے۔

پندرہ روز بعد ہمیشہ آپ کے لئے

آپ کا جاوید

جاوید کا یہ مزاحیہ خط پڑھ صفیہ کو ہنسی بھی آئی اور شرم بھی۔ بارے شکر ہے انہوں نے کھل کر آج اتنا تو لکھا۔ صفیہ مسرت سے سوچ رہی تھی۔

شب کو بستر پر دراز ہوئی تو اس کے ساتھ اس کی آنے والی مسرت بھی دراز تھی۔ وہ خود کو دلہن محسوس کر رہی تھی۔ ابھی خالی حجلہ والی دلہن مگر یہ پندرہ روز!

باہر پھیلی ہوئی رات کی تاریکی اور کمرے کی روشن شب میں پڑی ہوئی وہ سوچ رہی تھی کہ زندگی کے بعض لمحات کس قدر کٹھن اور طویل ہوتے ہیں۔ خاص طور پر انتظار کے دن!

یہ کسی نوجوان لڑکی کی بے چینیاں نہ تھیں بلکہ ایک عورت کا فطری اضطراب تھا جسے ذمہ دار فرد کی حیثیت سے سب سے پہلے حضرت فاروق اعظمؓ نے تاڑا تھا اور جبھی حکم دے دیا تھا کہ میدان جنگ سے مجاہدین کو گھر آنے کی رخصت ملتی رہنی چاہیئے۔

صفیہ کا مجاہد کہیں باہر میدانِ جنگ میں نہیں گیا ہوا تھا بلکہ شہر ہی میں مصروفِ جہاد تھا مگر ابھی شرعاً اس مجاہد کو صفیہ کی شب ہائے خاموش کو آباد کرنے کی اجازت نہیں ملی تھی۔

میاں بیوی بن جانے کے بعد جاوید اور صفیہ کی باہمی محبت ایسی تھی جیسے دو سچے، پُرخلوص، بے غرض اور صاحبِ ایثار دوستوں کے درمیان ہوا کرتی ہے (آج کل ایسے دوست ناپید ہیں) ان کی محبت کو میں زن و شوہر کی محبت اس لئے نہیں کہہ رہا ہوں کہ میاں بیوی کے درمیان اکثر رنجش، ناچاقی بلکہ لڑائی تک ہوتی رہتی ہے۔ صفیہ و جاوید اس سے محفوظ تھے۔

جاوید و صفیہ کا اتصال بڑا مبارک و پُر مسرت ثابت ہوا۔ دونوں کے درمیان یوں اور بھی ازدواجی مسرت پیدا ہو گئی تھی کہ یہ جوڑا بُردبار، خانگی ذمہ داریوں کو سمجھنے والا اور ایک دوسرے کے لئے پُر ایثار واقع ہوا تھا۔

صفیہ کے نکاح کے بعد کئی روز تک شمی ایک اجنبی مرد کا اپنی ماں اور گھر پر تسلط دیکھ کر پریشان سی رہی۔ یہ اجنبی مرد اس کا باپ تھا۔ سوتیلا ہی سہی مگر اس انجان آدمی میں شمی نے نہ صرف اچھا باپ بننے کی صلاحیت پائی بلکہ وہ بہت اچھا شوہر بھی ثابت

ہو رہا تھا۔

پھر شمی خود بھی تو جاوید کو اچھا سمجھتی تھی۔ اس کے علاوہ چند روز قبل جب کہ جاوید اس گھرانے کا ابھی مالک نہیں بنا تھا، شمی کی یہ کیفیت تھی کہ اکثر رات کو اس کی آنکھ کھل جاتی تھی اور وہ رات کے سناٹے، باہر کتوں کے واویلے اور سڑک پر کسی راہ گیر کے پیروں کی آواز سن کر ڈر جاتی تھی۔

اس طرح ہر چند وہ بڑے حوصلے سے کالج آتی جاتی تھی مگر نظر بازوں کو اپنی جانب نگراں پا کر اندر سے اس کا کلیجہ ہونے لگتا تھا۔ اگر خدانخواستہ کسی نے کبھی کوئی ناشائستہ حرکت کی۔ اس پر ذلیل عاشقانہ فقرے کسے یا کسی بیہودہ شخص نے پکڑ لیا تو وہ کس سے کہتی کہ دیکھئے فلاں شخص نے میرے ساتھ یہ خلاف تہذیب حرکت کی ہے اور کون اس کی خاطر ایسی حرکت کرنے والے کی جا کر خبر لیتا۔

مگر اس گھر میں جاوید کے آجانے کے بعد سے گویا شمی کا دل ٹھکانے آگیا تھا۔ رات کو اگرچہ اسے اب دوسرے کمرے میں سونا پڑتا تھا لیکن خاموش راتوں کا پُر اسرار خوف اب زائل ہو گیا تھا۔ اس کے بجائے اسے بڑی تقویت سی ہو گئی تھی۔

اسی طرح کالج جانے میں بھی اب وہ نڈرپن محسوس کر رہی تھی۔ لاکھ جاوید اس کے ساتھ نہ ہوتا بلکہ کہیں دور اپنی ڈیوٹی پر مصروف ہوتا مگر شمی اپنے گھر سے اس کا وابستہ ہونا اپنے لئے بہت بڑا سہارا اور باعث طمانیت محسوس کرنے لگی تھی۔

اگر شریر لوگ عادتاً اسے گھورتے تو وہ اپنے دل میں یہ زعم پانے لگتی کہ جاوید کو اطلاع کرنے کی دیر ہے۔ وہ آکر شہر کے تمام بدمعاشوں کو ٹھیک کر دے گا۔ بحیثیت پولیس آفیسر کے نہیں بلکہ نگران اور رباب کی حیثیت سے وہ ہر شر اور خطر کے خلاف شمی کی حفاظت کو آجائے گا۔

یہی عقیدہ خدا کے باب میں پختہ ہو کر جب انسان کے دل و روح میں جم جاتا ہے تو وہ اس نگہبان قدرت کو ہمیشہ اپنے ساتھ پاتا ہے اور اسی عقیدے کی آنچ سے انسان عظیم کارنامے کر گزرتا ہے۔

ایک روز نجانے کیوں شمی نے صفیہ سے سوال کیا۔

امی! کیا جاوید صاحب واقعی ہمارا اتنا ہی خیال رکھتے ہیں جتنا کہ وہ ظاہر کیا کرتے ہیں؟

صفیہ نے اس کا سوال نظر انداز کر کے سوال کیا۔

کیا شمی تمہیں اب بھی ان کا نام ہی لینا چاہیئے ؟

شمی نے کہا۔

میں ان کے سامنے تو انہیں ابا جان ہی کہتی ہوں، اگرچہ کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔

صفیہ نے کہا۔

سامنے یا غیبت کا سوال نہیں۔ وہ اب تمہارے باپ ہیں اور ہمیشہ اسی طرح مخاطب کئے جانے چاہئیں۔

جاوید نے نمودار ہو کر ہنستے ہوئے کہا۔

تم مجھے جاوید ابا کہہ سکتی ہو شمی!

صفیہ بھی ہنسنے لگی مگر شمی کچھ پریشان سی ہو گئی۔

صفیہ ہنستی ہوئی بولی۔

ہاں جس طرح لوگ کسی کو قاسم بھائی یا ماموں اختر کہہ کر مخاطب کیا کرتے ہیں۔

جاوید نے مسکرا کر شمی سے پوچھا۔

ٹھیک ہے نہ شمی بیٹی ؟

صفیہ نے شمی کے الفاظ جاوید کے سامنے دہراتے ہوئے کہا۔

اچھا شمی مجھ سے ابھی یہ دریافت کر رہی تھی کہ آیا جاوید صاحب ہمارا اتنا ہی خیال رکھتے ہیں جتنا کہ ظاہر کرتے ہیں۔

اب شمی اور بھی جز بز ہوئی۔ واقعی اس کی ماں اور جاوید ایک جان ہو چکے تھے۔ کوئی بات ایک دوسرے سے پوشیدہ نہیں رکھتے تھے۔ شمی سوچ رہی تھی۔

جاوید نے اپنی بیوی سے کہا۔

شمی کا یہ سوال شاید بے جا نہ ہو کیونکہ تم نے اس قدر جلد بہشت مسرت میرے لئے پیدا کر دی ہے کہ میں اس میں گم ہو کر شمی کے باب میں غافل ہو گیا ہوں۔

شمی نے آخر کہا اور پھر بولی

سوال میرا بیجا ہی تھا ابا جان۔

اسے میری ناسپاسی سمجھئے ورنہ جب سے آپ ہمارے نگران ہوئے ہیں، میں خود کو مکان اندر مکان سے باہر تمام خوف و خطر سے آزادی محسوس کرنے لگی ہوں۔

صفیہ نے مسکرا کر شمی سے دریافت کیا۔

پہلے تمہیں کیا چیز ڈراتی رہتی تھی؟

شمی نے جواب دیا۔

جو چیز آپ کو ڈراتی رہتی تھی۔

صفیہ اسی طرح مسکرا کر بولی۔

تو گویا اب جاوید صاحب نے ہماری حفاظت کے لیے موکّل مقرر کر دیئے ہیں۔

جاوید نے صفیہ سے کہا۔

بھئی! ہم تو تمہارے متوکل ہیں۔

صفیہ نے ستّی سے کہا۔

ہاں ستّی خوب یاد آیا۔ تمہارے ان ابّا صاحب نے تمہارے کالج آنے جانے میں حفاظت کے لئے ایک دو سپاہی مقرر کر دیئے ہیں۔

جاوید نے صفیہ سے کہا۔

نہیں صفیہ میں سرکاری سپاہیوں سے نجی کام لینے کا روادار نہیں۔ وہ میرا اپنا تنخواہ دار آدمی ہے جو ستّی کے ساتھ آتا جاتا ہے۔

ستّی نے جاوید کے اس انکشاف سے متاثر ہو کر کہا۔

ابّا! آپ دوسرے افسروں سے کس قدر مختلف ہیں اور افسر تو اپنے ماتحتوں کو اپنا غلام سمجھتے ہیں۔

جاوید نے مسکرا کر صفیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
غلامی کا جہاں تک تعلق ہے شمی! میں کبھی کسی کے حق میں
خط غلامی کہہ چکا ہوں۔
شمی اس کنایہ کو نہیں سمجھی مگر صفیہ ہنسنے لگی۔

شادی کے بعد صفیہ اور شمی فوراً ہی جاوید کے بنگلہ میں منتقل ہو گئی تھیں۔ جس مکان میں یہ دونوں ماں بیٹی رہا کرتی تھیں ذاتی نہ تھا بلکہ کرائے کا تھا۔ پھر ویسے بھی اس مکان میں تین ہولناک ٹریجڈی ہو چکی تھیں۔ شمی کا اغوا، صفیہ کے پہلے شوہر کا قتل اور اس کے بعد خود صفیہ کا بھی اغوا۔

لیکن شکر ہے جاوید سے ہمیشہ کے لئے وابستہ ہونے کے بعد سے اب دونوں ماں بیٹی کے لئے حادثات ختم ہو چکے تھے اور عیش و عشرت کی زندگی گزار رہے تھے۔

ادھر فرید بھی اپنی تعلیمی سرگرمی اور قومی خدمات کی تھکا ڈالنے والی مصروفیت میں شمی کی زیارت کر کے آسودگی حاصل کر لیا کرتا تھا۔ پہلے شمی کا گھر اس کے لئے اجنبی تھا جہاں اس کا آنا جانا مباح نہ تھا مگر اب شمی کی والدہ اس کی ممانی تھی اور فرید اپنے ماموں جاوید سے دلی ارادت کے سلسلہ میں اس کے مکان پر جاتا رہتا تھا۔

اور اب تو فرید کی آمد و رفت جاوید کے ہاں کافی بڑھ گئی تھی۔ اس کی محرک حقیقت میں تھی تو شمی ہی مگر حفصہ کا طرزِ عمل فرید کے ساتھ انہوں کا سا تھا۔ پھر وہ کیوں نہیں اس کے پاس آتا۔

مگر شمی کا فرید کے ساتھ طرزِ عمل اب تک وہی تھی وہی گریز، وہی اگلی بدگمانی اور وہی اظہارِ بیزاری۔ فرید سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شمی اپنے اغوا میں اب تک اسے عبید کا شریک کار سمجھنے کی بدگمانی میں مبتلا ہے۔ کیونکہ اس واقعہ کو دو سال کے قریب گذر گئے تھے اور زمانہ فرید کی نیک چلنی کا شاہد تھا۔

لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ غریب فرید سے شمی ایسی

بدگمان ہوئی کہ اس کے متعلق اس نے کبھی کوئی تحقیق ہی نہیں کی۔ فرید تو از خود اپنی پوزیشن صاف کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کرتا۔ اسے تو گمان بھی نہ تھا کہ شمی کے دل کا تکدر کسی غلط فہمی کی بناء پر ہے۔

شمی فسٹ ایئر میں تھی اور فرید تھرڈ ایئر میں۔ وہ اپنے ماموں کے ہاں آتا تو اس کا دل چاہتا کہ شمی کی تعلیمی دشواریاں حل کرنے میں اس کی مدد کرے مگر شمی اسے کوئی موقع نہیں دیتی۔

فرید نے شمی کی انگریزی کی کاپی اٹھا کر کہا۔

آپ نے انگریزی صحیح نہیں لکھی ہے۔ اس ایک ہی صفحہ میں گرامر کی متعدد غلطیاں ہیں۔

صفیہ، جاوید اور شمی سہ پہر کی چائے پی رہے تھے کہ فرید بھی آ ٹپکا تھا اور صفیہ و جاوید کے اصرار پر چائے میں شریک ہو گیا۔

شمی نے اس کے ہاتھ سے کاپی چھین کر کہا۔

آپ سے کس نے کہا تھا کہ ہماری انگریزی کی کاپی دیکھئے۔

فرید نے دوبارہ شمی کے ہاتھ سے کاپی چھین لی اور

جاوید کو دکھانے لگا۔
ذرا دیکھئے تو ماموں کتنا غلط جملہ لکھا ہے انہوں نے
یہ۔
صفیہ ان دونوں کی چھینا جھپٹی سے ہنسنے لگی۔
شمی نے اپنی ماں سے اپیل کی۔
اچھی امیّ! ہماری کاپی دلا دیجئے ان سے۔
جاوید نے فرید سے کہا۔
لیکن فرید تم نے شمی کی اجازت کے بغیر ان کی کاپی کو
کیوں چھوا۔
صفیہ نے اپنے شوہر سے مسکرا کر کہا۔
تم بھی جاوید عجیب الٹی ہانکنے لگے۔ ایک تو فرید نے
از راہِ ہمدردی شمی کی غلط انگریزی کی اصلاح کی۔ اس پر تم فرید
ہی ڈانٹنے لگے۔
جاوید نے کہا۔
میں نے فرید کو ڈانٹا کب تھا؟
شمی بولی۔
اور انہوں نے اصلاح کب کی ہے۔ ویسے ہی کہنے لگے

کہ غلط انگریزی لکھی ہے میں نے۔

فرید نے مسکرا کر کہا۔

اچھا ماموں! آپ درست کیجئے شمی کی اس انگریزی کو۔ مجھے آپ کی انگریزی کی قابلیت بھی دیکھنا ہے۔

جاوید نے کہا۔

اچھا! اب تم میرا امتحان بھی لینے لگے۔ اب بھی میں تمہیں اور تمہارے پروفیسر کو پڑھا سکتا ہوں۔

صفیہ نے مسکرا کر کہا۔

بلکہ شاید پرنسپل کو بھی مگر ڈرتے کیوں ہیں۔ کیجئے نہ شمی کی انگریزی درست۔ مجھے بھی دیکھنا ہے کہ ماموں بھانجہ میں سے کس کی انگریزی اچھی ہے۔

جاوید نے کہا۔

تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ میں پرانا گریجویٹ ہوں اور پرانے گریجویٹ بڑے قابل ہوتے ہیں۔

فرید نے صفیہ سے کہا۔

دیکھ لیا نہ آپ نے شانی جان! صرف دھونس ہی دھونس میں ماموں اپنی قابلیت منوانا چاہتے ہیں۔

ششی نے جاوید سے کہا۔
اچھا ابا جان! آپ اصلاح کیجئے میری کاپی میں۔
فرید بولا۔
پہلے مجھے کرنے دو ششی۔ مجھے بھی تو ماموں سے اپنی قابلیت منوانی ہے۔
آخر ششی راضی ہوگئی۔
اچھا یہاں میرے سامنے رکھ کر اصلاح کیجئے۔
فرید نے وہیں میز پر کاپی رکھ کر ششی کی انگریزی کی اصلاح شروع کردی۔
ششی نے فرید کی تحریر کو دیکھتے ہوئے کہا۔
توبہ! کتنا بُرا خط ہے۔ مجھ سے تو پڑھا بھی نہیں جاتا۔
فرید لکھتے لکھتے مسکرا کر بولا۔
بڑے آدمی بدخط ہی ہُوا کرتے ہیں۔
صفیہ نے مسکرا کر کہا۔
جب ہی تمہارے ماموں کا اُردو تک کا خط بُرا ہے
فرید نے چار پانچ منٹ میں ششی کے پورے صفحہ کی تصحیح کر دی مگر ششی کچھ اس کے لفظ پڑھ سکی، کچھ نہ پڑھ سکی۔

جاوید نے فرید کے ہاتھ سے کاپی لے کر کہا۔
دکھانا ذرا مجھے۔
اور پڑھنے لگا۔ششی بھی اس کے قریب جا کھڑی ہوئی۔
ششی نے جاوید سے کہا۔
زور سے پڑھئے ابّا۔ مجھ سے ان کا لکھا ہوا پڑھا نہ جا سکا۔
وہ زور سے پڑھنے لگا۔
جاوید نے ختم کر کے کہا۔
ماننا پڑھتا ہے کہ فرید ہے قابل لڑکا۔
صفیہ بہت خوش ہوئی اور جاوید کو فرید کی انگریزی کی تعریف کرتا دیکھ کر ششی کو زیادہ خوشی نہیں ہوئی۔
جاوید نے ایک دو جگہ تبدیلی کرتے ہوئے کہا۔
فرید میاں اس جگہ یہ لفظ موزوں رہے گا۔
فرید کو مسکرا کر بولا۔
جائے ماموں خالی است۔
صفیہ نے فرید سے کہا۔
فرید میاں! تم دل میں سوچو گے تو سہی کہ بیگاری کمہ عرش پر

بھی بیگار مگر شمی کی انگریزی ٹھیک کر دو گے تو تمہاری مہربانی ہوگی۔
فرید نے مسکرا کر کہا۔ اس نے شمی کو ہلکے سے چھیڑ دیا تھا۔
آپ کی فرمائش سر آنکھوں پر ممانی جان مگر یہ چیز خود
طالب علم کے اپنے شوق یا بدشوقی پر موقوف ہے۔
شمی بولی اور اپنی جگہ پر جا بیٹھی۔
ہم کسی کی محتاج نہیں۔

آج فرید اپنے ماموں کے ہاں سے آیا تو شمی کو دیکھ لینے کے بعد اپنی حالت روزمرہ کے مقابلہ میں مختلف پا رہا تھا۔ اسے اندازہ نہ ہو سکا تھا کہ اس کے بارے میں شمی کی کیا رائے یا خیالات تھے۔ بس اتنا محسوس کر سکا تھا کہ وہ عام لڑکیوں سے مختلف واقع ہوئی تھی اور اس کا جسم تو جوان ہو گیا تھا مگر شاید اس کے جذبات پر ابھی جوانی طاری نہیں ہوئی تھی اگر یہی بات تھی تو شمی بہت اچھی لڑکی ہے۔ اس میں سستا پن، خود اور مصنوعی شوخیاں نہ تھیں مگر ساتھ ہی اس کا

غرور و تمکنت وغیرہ بھی حوصلہ شکن واقع ہوئے تھے۔
اس کے باوجود بھی فرید کا دل یہی چاہتا تھا کہ اگر شمی کے پاس وقت گزرے تو حاصل حیات ہے حالانکہ فرید اپنی حیات کا سودا قوم و وطن سے کر چکا تھا اور اپنے ملک کی ترقی و بہبود کے لئے اسے جان سے بھی دریغ نہ تھا۔
اس خیال سے کہ اس کا جاوید کے پاس جلد جلد آنا جانا کہیں شمی یا صفیہ کو شاق نہ گزرے۔ فرید ہفتوں تک ان کے ہاں نہ جاتا۔ یہاں تک کہ جاوید یا صفیہ کبھی فرید کے مکان پر آتی تو اس سے پوچھتی کہ آج کل وہ اس کے ہاں کیوں نہیں آتا۔
شمی کی سالگرہ اگلے ہفتے ہونے والی تھی۔ چنانچہ صفیہ اس تقریب کی دعوت دینے فرید کے ہاں آئی ہوئی تھی تاکہ اس کے (فرید کے) والدین بھی شرکت کریں۔
چلتے چلتے صفیہ اس سے بھی بولی۔
تمہیں بھی فرید ضرور آنا ہے۔
فرید مسکرا کر بولا۔
میں اس چلتی ہوئی دعوت کا قائل نہیں بھائی جان!
صفیہ نے کہا۔

کیا تمہارے پاس غیروں کا سا چھپا ہوا دعوت نامہ
بھیجا جائے۔

فرید نے مسکرا کر کہا۔

مجھے آپ غیر ہی تو سمجھتی ہیں۔

صفیہ نے کہا اور مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

اچھا چا دید سے شکایت کرنا ہے تمہاری۔

آخر تقریب کا ہفتہ آ گیا اور فرید کے والدین صفیہ کے ہاں تقریب میں پہنچے مگر فرید ان کے ساتھ نہیں گیا۔ سوچ رہا تھا کہ جس کی تقریب ہے۔ اگر اس نے سیدھے منہ بات نہیں کی یا اس کا تحفہ قبول نہیں کیا تو بڑی دل شکنی ہو گی۔ پھر تحفے کے باب میں بھی وہ شمی کے مذاق سے ناواقف تھا۔

بہر حال اس نے ایک قیمتی قلم کا سیٹ خریدا اور شام کو کافی دیر بعد اپنے ماموں کے مکان پر پہنچا۔ اگر شمی نے یہ سیٹ قبول نہ کیا تو خیر میرے کام آ جائے گا۔ اس نے دل کو سمجھانا شروع کیا۔

شکر ہے تقریب میں مہمان زیادہ نہ تھے۔ مرد تو دو تین

ہی تھے۔ وہ بھی شاید جاوید کے محکمے کے افسر ہی ہوں گے ورنہ زیادہ تر شمسی کے کالج کی لڑکیاں تھیں یا ایک دو پڑھانے والیاں۔

قومی لگن پیدا ہو جانے کے بعد سے فرید پر سادہ پوشی نے خود بخود قبضہ کر لیا تھا مگر تھا چونکہ وہ زیب النساء اس لئے ہر لباس اس پر جچتا تھا۔

صفیہ نے بڑے سلیقے سے ہال سجایا تھا۔ پورے فرش پر نفیس اور دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ ہال کی وسعت میں چوطرفہ عمدہ صوفے جمے ہوئے تھے۔ درمیان میں کئی نقشین، مزین اور گلدان نفاست سے رکھے ہوئے تھے۔ کھڑکیوں پر ارغوانی رنگ کے ریشمیں پردے لٹکے ہوئے تھے۔

ہال کے آخری حصہ میں تین مرد مہمان بیٹھے ہوئے جاوید سے باتیں کر رہے تھے۔ باقی تین چوتھائی ہال پر شمسی کے کالج کی لڑکیوں کا قبضہ تھا جن کے مترنم قہقہوں سے فضا گونج رہی تھی۔

فرید نے نمودار ہو کر کہا۔

ممانی جان آداب!

وہ غلطی سے زنانہ دروازے سے داخل ہو گیا تھا اور اس کے داخل ہوتے ہی وہاں کے مہمانوں کی نظریں اس پر لگ گئی تھیں۔ چنانچہ خفت چھپانے کے لئے اس نے دور سے اپنی ممانی جان کو آداب کھینچ مارا۔

جواباً صفیہ نے عورتوں کے درمیان میں سے سر اونچا کر اسے دیکھا اور مسکرائی۔

فرید جلدی سے پلٹ کر مردوں کے کونے کی طرف چلا گیا اور صفیہ بھی اس کے پیچھے پیچھے ایک دو منٹ کے لئے آگئی۔

اسے دیکھتے ہی جاوید نے اس کی ٹانگ لی۔

یعنی تم آج بھی اپنے روزمرّہ کے سوٹ میں آئے ہو؟

فرید نے ہنس کر جاوید سے کہا۔

سبحان اللہ! کس عمدگی سے آپ نے مہمانوں سے میرا تعارف کرایا ہے

جاوید بھی ہنسنے لگا۔

جاوید نے مہمانوں سے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

اسے میں اپنا بھانجا سمجھتا ہوں اور یہ نامعلوم مجھے کیا سمجھتا ہے

فرید مسکرا کر بولا اور بیٹھ گیا۔
ماموں کے بجائے ہیں آپ کو چچا بنا کر تو چھوڑنے سے رہا۔
جاوید نے مہمانوں سے کہا۔
یہ بڑا ہونہار لڑکا ہے مگر میں اب تک اندازہ نہیں لگا سکا کہ یہ کیا بنے گا۔
ایک پولیس آفیسر مسکرا کر جاوید سے بولا۔
انہیں بھی اپنی لائن میں لے لیجئے۔
جاوید نے مسکرا کر کہا۔
لائن میری بھی وہی ہے جو آپ صاحبان کی ہے۔ یعنی فیض رسانی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آپ کی پشت پر حکومت ہے اور اپنی پشت پر اللہ میاں۔
وہی افسر مسکرا کر بولا۔
آپ کی پشت تو مضبوط ہوئی مسٹر۔ مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ آپ کی کیا لائن ہے۔
جاوید نے کہا۔
فرید میاں نے قومی و ملکی خدمات کی لائن پکڑی ہے اور

شاید یہی ان کی مستقل لائن ہو جائے۔

دوسرے افسر نے کہا۔

یہ لائن بھی کافی پُرخطر ہے۔

صاحب! خطرات ہی میں زندگی ہے۔ اگر کوئی سپاہی خطرات کو نظر انداز کر کے عیش کا دلدادہ ہو جائے تو وہ پھر سپاہی نہیں رہتا۔

جاوید بولا۔

ہاں بیشک مجاہد کے ہاتھ میں تلوار ہی رہنی چاہیئے۔

صفیہ مسکراتی ہوئی قریب آئی اور فرید سے بولی۔

آؤ میاں فرید! شربت پی لو۔

فرید نے مسکرا کر کہا۔

شربت ممانی جان! میں تو کچھ کھاؤں گا۔

جاوید نے کہا۔

تم اپنی ممانی کی ترکیب کو نہیں سمجھے فرید۔ وہ اس بہانے سے تمہیں یہاں سے اٹھا کر لے جانا چاہتی ہیں تاکہ ان کا کچھ ہاتھ بٹا سکو۔

فرید نے کہا اوہ! اور اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کے لئے تو میں بخوشی تیار ہوں۔
جاوید نے مسکرا کر اپنی بیوی سے کہا۔
صفیہ! اب ان مہمانوں کا بھی قصور معاف کردو نہ۔
صفیہ نے جواب دیا اور فرید کو لے کر چلی گئی۔
بس چند منٹ کی دیر اور ہے۔

ڈرائینگ روم میں فرید کو لے جا کر صفیہ بولی۔
میں نے تمہیں اس لئے تکلیف دی ہے کہ کھانے کے کمرے میں میز پر مردوں کے لئے کھانے پینے کی چیزیں چُن دو۔
فرید نے کہا۔
اس میں تکلیف کی کیا بات ہے۔ بہت اچھا آپ جایئے میں سب چیزیں سلیقہ سے میز پر رکھ دوں گا۔
صفیہ نے جاتے جاتے کہا مگر پھر لوٹ آئی۔

نوکروں سے مدد لے لینا۔ وہ بیکار دوڑے دوڑے پھر رہے ہیں۔

اس نے دریافت کیا۔

کیا عورتوں کا انتظام بھی اسی کمرے میں کر دیں فرید؟

فرید نے مسکرا کر کہا۔ صفیہ ہنسنے لگی

اس معاملہ میں بندہ کچھ عرض نہیں کر سکتا معافی۔ یہ آپ اور ماموں جانیں۔ دراصل اس مسئلہ کا تعلق خود عورتوں کے اپنے شوق نمود یا عدم اشتیاق نمائش پر ہے۔

صفیہ نے کہا۔

اچھا دیکھو ابھی لڑکیوں سے جا کر پوچھتی ہوں کہ وہ کہاں کھانا پینا پسند کرتی ہیں۔

فرید نے کہا۔

خدا کرے، وہ دوسرے کمرے کو رونق دینا پسند کریں۔

صفیہ نے مسکرا کر کہا اور چلی گئی۔

ڈرتے ہو ان سے، اس طرف آنہ جانا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سب لڑکیاں مل کر تمہارا مذاق اڑانے لگیں۔

فرید نے ملازموں کی مدد سے جلد جلد کھانے پینے کی تمام چیزیں میز پر چن دیں اور فرید مہمانوں کو بلانے کے لئے ان کے کمرے میں چلا گیا مگر جاوید اور دوسرے پولیس افسر جرائم وغیرہ پر بحث میں مصروف تھے، اس لئے فرید کو بھی وہیں بیٹھ جانا پڑا۔

آخر چند منٹ بعد جاوید نے اپنے ساتھیوں سے کھانے کے کمرے میں چلنے کی درخواست کی۔ غرض سب اٹھ کھڑے ہوئے اور ڈرائینگ روم میں پہنچے مگر کمرے کی تین چوتھائی نشستوں پر شمی کے کالج کی لڑکیاں آکر پہلے ہی سے قابض ہو گئیں تھیں۔

صفیہ نے مسکرا کر مرد مہمانوں سے کہا۔

اور دیر کر کے آیئے۔

جاوید نے مسکرا کر کہا۔

یہ کیا گیا۔ ہم کون سی بازی ہار گئے۔ یہاں بھی جاتے ہیں۔

اور میز کے آخری کونوں پر مع اپنے ساتھیوں کے جا بیٹھا۔ یہاں فرید نے کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں رکھی تھی۔

آراستہ پیراستہ شمی اپنی سہیلیوں کے درمیان بیٹھی ہوئی تھی۔ فرید نے ڈرتے ڈرتے اس طرف دیکھا اور دہشت زدہ سا ہو گیا کیونکہ دوسری لڑکیاں شرارت سے اُسے دیکھ رہی تھیں۔

ان معزز مردوں کی موجودگی میں لڑکیاں ہنسی مذاق اور آپس کی چہل سے قاصر تھیں مگر پھر بھی جو ذرا شوخ واقع ہوئی تھیں باز نہ آئیں۔ کبھی شمی کو چھیڑنے لگتیں، کبھی آپس میں چپکے چپکے مذاق کرنے لگتیں۔

ایک لڑکی نے ابرو سے فرید کی طرف اشارہ کر کے شمی سے پوچھا۔

یہ کون بزرگ ہیں شمی ؟

دوسری لڑکی نے چپکے سے جواب دیا۔

شمی کا ہونے والا دولہا۔

شمی نے آہستہ سے ڈانٹا۔

چُپ رہو۔ کیا بکتی ہو۔

ایک لڑکی نے سرگوشی میں شمی سے دریافت کیا۔

کیا تم ایمان سے کہہ سکتی ہو کہ وہ شخص تمہیں پسند نہیں کرتا۔

ششی نے منہ بنا کر جواب دیا۔
اس کی ذمہ دار میں نہیں۔
دوسری لڑکی بولی۔
اچھا! کیا تم ہمیں یقین دلا سکتی ہو کہ تم اسے پسند نہیں کرتیں؟
ششی نے اسی طرح منہ بنا کر کہا۔
نہیں! بلکہ میں تو اس سے بیزار ہوں۔
ایک لڑکی بولی۔
تعجب ہے۔ آخر کیوں؟
حنیفہ نے مسکراتے ہوئے قریب آ کر کہا۔
ان سرگوشیوں کے ساتھ کھانے پینے کا سلسلہ بھی جاری رہا لڑکیو۔
تمام مہمان خورد و نوش میں مصروف ہو گئے۔
چند لڑکیوں نے ششی سے دریافت کیا۔
کھانے کے بعد مشاعرہ ہو گا یا گانا؟
ششی نے جواب دیا۔
کچھ نہیں، بس بس اپنے گھروں کا راستہ لینا۔

لڑکیوں نے کہا۔

واہ! ہم تو تمہاری والدہ سے قوالی کی فرمائش کریں گے

ششی نے کہا۔

مشاعرے، رقص، قوالی وغیرہ مردہ کاہل اور نکمی قوموں کا کام ہے۔ اس زمانہ میں تو سائنٹفک اکتشافات کرنے چاہئیں۔

اختری نے کہا

آخر ہو نہ فرید کی بہن، وہ بھی لوگوں کو یہی تلقین کرتا ہے۔

یہ وہی بھدی سی لڑکی تھی جو اغوا سے قبل اور اغوا کے روز بھی ششی کے ساتھ تھی اور اس حقیقت کی بھی چشم دید تھی کہ اس روز ششی کی مدد کو سب سے پہلے فرید ہی دوڑا تھا اور پھر پولیس کو بلا کر لایا تھا۔ اس موضوع پر اختری اور ششی کے درمیان آج تک گفتگو نہیں ہوئی تھی۔

فرید اپنی خاموش قومی خدمات کے باوجود محبِّ وطن مردوں اور عورتوں کی نگاہ میں آ چکا تھا، حالانکہ وہ ہمیشہ یہی کوشش کرتا تاکہ اس کی حقیر خدمات نام و نمود سے بچی رہیں۔

ایک لڑکی نے پھر فرید کے متعلق کرید شروع کی۔
اچھا تو خیر سے یہ بزرگ کوئی قومی ہیرو بھی ہیں۔
اختری نے کہا۔
ارے بھئی! وہ رشتہ میں جاوید صاحب کا بھانجہ ہوتا ہے۔
اسی سوتیلے سلسلہ میں وہ ششی کا بھی ماموں زاد بھائی ہُوا۔
چند لڑکیوں نے کہا۔
آہا! یہ تم نے اب منہ سے پھوٹا ہے۔ ششی نے اس سے اب تک اس حیثیت سے اس کو متعارف ہی نہیں کرایا تھا۔
ششی نے کہا۔
اب جا کر تم لوگ اس سے تعارف کو لو۔
پھر لڑکیوں نے چپکے چپکے ششی کو چھیڑنا شروع کیا۔
ایک افسر نے اُدھر گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔
جرم بھی دراصل ایک آرٹ ہے۔
جاوید نے کہا۔
اور اسے پکڑنا اس سے بھی بڑا آرٹ۔
دوسرے افسر نے کہا۔
افراد کی مالی مشکلات حل کرنے سے جرائم میں کمی واقع

ہو سکتی ہے۔

جاوید نے کہا۔

ایک حد تک۔ جرم دراصل ایک بوجھ ہے جس کو مجرم لوگ اپنے اپنے مختلف طریقوں سے اٹھاتے ہیں جہاں شخص مالی مشکلات سے تنگ آکر لوگ جرم کرتے ہیں۔ وہاں دوسرے اسباب کی بناء پر بھی جرائم کا صدور ہوتا ہے، مثلاً غلط تربیت، ابتدائی یا درمیانی بری سوسائٹی، گندہ ماحول، خراب و غیر متوازن غذا، اور جہل یہ بھی جرائم کے بڑے اسباب میں سے ہیں۔

فریدہ نے کہا۔

یہ درست ہے ماموں جان! مگر بعض جرائم فقط لذت جرم و گناہ کی بناء پر بھی کئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ شاید آپ حضرات اتفاق کریں گے کہ کوئی جرم صرف لمحی اضطرار یعنی IMPULSE OF MOMENT میں سرزد ہو جاتا ہے۔ مثلاً انسان کی نیت مطلق جرم کی نہ ہو مگر اتفاقاً طیع کا ایک لمحہ ایسا آگیا کہ جب وہ گزرا تو غیر ارادی طور پر آدمی نے خود کو مجرم پایا۔

شاید فرید کے ساتھ ایسا ہی ہوا ہوگا بشمی نے اس کے الفاظ سن کر دل میں کہا۔ فرید کی نیت اس روز اس کے (اشتی کے) اغوا میں عبید کی مدد کرنے کی نہیں ہو گی مگر پھر ایکا ایکی اس کا شریکِ کار ہو گیا ہو گیا۔ بشمی وہی بر بنائے غلط فہمی سمجھ رہی تھی۔

ایک افسر نے کہا۔

ہاں مسٹر فرید یہ ممکن تو ہے۔

جاوید نے کہا۔

میری رائے میں مرکزی طور پر اور صوبائی انداز میں ہر ماہ

پولیس کا ایک رسالہ شائع ہونا چاہیئے جو شہری انتظامات اور جرائم وغیرہ کے مختلف عنوانات پر مشتمل ہو۔

فرید نے کہا۔

یہ آپ میرے منہ کی بات لے اُڑے ماموں جان، پولیس کا ایک میگزین ماہانہ ضرور شائع ہونا چاہیئے۔ مختلف ابواب ہوں۔ مثلاً ٹریفک کے تمام قاعدے بالخصوص پیدل چلنے والوں کے لئے ہدایات کہ کس طرح پٹڑی پر چلیں اور آتے جاتے ٹریفک سے بچے ہوئے کیونکر سڑک پار کی جائے۔ دوسرا عنوان شہریت و شہری انتظامات کے بارے میں ہو تیسرا کرمنلوجی یعنی علم الجرائم پر ہو۔ اس کے علاوہ جتنے خطرناک اور خاص خاص قسم کے مجرم ہیں ان کے فوٹو مختلف پوز سے شائع کیئے جائیں۔ مثلاً ان کے ڈاڑھی لگا کر، جٹائیں بڑھا کر، صرف مونچھ کے ساتھ اور صفاچٹ چہرے کے ساتھ بھی۔ اس سے سب سے بڑا ایک فائدہ تو یہ ہوگا، ایسے مجرم پبلک کے علم میں بھی آجائیں گے اور وہ بھی ان کی نشان دہی میں پولیس کی مدد کر سکے گی۔ دوسرے ایک عظیم فائدہ یہ ہوگا کہ مفرور یا قید سے چھوٹے ہوئے مجرم شب و روز پریشانی اور بے اطمینانی کی

زندگی میں مبتلا رہیں گے۔ کیونکہ انہیں معلوم ہو جائے گا کہ ان کے فوٹو پولیس میگزین میں شائع ہوتے ہیں۔

صفیہ نے مسکرا کر کہا۔

تم خواہ کتنے ہی جتن کرو۔ تمہارے ماموں تمہیں پولیس کے محکمے میں تو نہیں جانے دیں گے۔

آخر ایک شوخ لڑکی بول پڑی۔

پولیس کے ایک ایسے رسالہ کا ایڈیٹر بھی فرید صاحب کو بنایا جائے۔

جاوید مسکرا کر بولا۔

فرید نے سوچنے کو بہیں مواد ضرور رکھ دیا ہے۔

فرید نے پولیس والوں سے دریافت کیا۔

اچھا آپ صاحبان مجرم کی شناخت کے لئے کن علامات کا خیال رکھتے ہیں۔

جاوید نے مسکرا کر کہا۔

تمہیں کیوں بتائیں، تم ہمارے آدمی نہیں ہو۔

فرید بولا۔

خیر نہ بتائیے مگر اس معاملہ میں میرا اپنا ایک چھوٹا سا مشاہدہ

ہے۔

ایک افسر نے دریافت کیا

کتابی؟

فرید نے جواب دیا۔

میں نے مشاہدہ کہا ہے مطالعہ نہیں۔ چنانچہ جو کچھ اس باب میں مختصر عرض کرنا چاہتا ہوں، وہ میرے ذاتی تجربہ اور مشاہدہ کا نتیجہ ہے۔

جاوید مسکرا کر بولا۔

اسے معلوم کرنے کے لئے ہم میں سے کوئی بے چین نہیں ہے۔ تاہم تم بیان کر سکتے ہو۔

فرید نے کہا۔

یہ تو کہنے کی ضرورت نہیں کہ تحقیقِ جرم کے سلسلہ میں کسی شے کو طے شدہ امر یا یقینی چیز نہیں سمجھنا چاہیئے بلکہ پولیس کے پرانے مقولے یعنی "شک کئے جاؤ۔ یہاں تک کہ ثابت ہو جائے،، پر عمل پیرا رہنا چاہیئے۔

ایک افسر نے کہا۔

اس مقولے پر سمجھدار پلیس افسر اب بھی عمل کرتا ہے۔

فرید نے کہا۔

جی ہاں۔ اب یہاں سے پولیس کو انسان کی نفسیات کو قابلیت سے پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ عام حالات میں آدمی (اگر اس کی طبیعت ہی اضطراری نہیں ہے) نیچرل نظر آتا رہتا ہے اب ایک سی آئی ڈی اور پولیس والے کو شہر کے بازاروں، گلی کوچوں یا ایسے ہی مقامات کا گشت لگانے کے دوران میں یہ بغور دیکھنا چاہیئے کہ آیا کوئی شخص اَن نیچرل یعنی عام انسان کی اصلی حالت سے ہٹا ہوا تو نہیں ہے۔ یہ یاد رکھئے کہ جس شخص کے دل میں چور رہے گا وہ خواہ مخواہ معمول سے ہٹی ہوئی بے تکلفی، شناسائی یا بات کا اظہار کرے گا۔ اس میں اس کی یہ غیر ارادی حرکت ہوتی ہے کہ وہ پولیس کو نادانستہ یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ دیکھو میں ایک صاف آدمی ہوں۔ مجھ پر کوئی شک نہ کرنا۔

ایک پولیس افسر نے مسکرا کر جاوید کی طرف دیکھا۔ وہ بھی جواباً مسکرایا۔

فرید نے اپنے ماموں سے کہا۔

شاید آپ میرے نظریے کو درست تسلیم نہیں کر رہے ہیں۔

صفیہ نے مسکرا کر فرید سے کہا۔

جاوید صاحب تمہارے نظریئے کو صحیح تسلیم کر رہے ہوں یا نہ کر رہے ہوں مگر میں اس میں اتنا اضافہ کرنا چاہتی ہوں کہ تمہارا موضوع پوری مجلس کے لئے شاید باعث دلچسپی نہیں۔

فرید کو فوراً اپنی کوتاہی کا احساس ہوا کیونکہ اس محفل میں خواتین بھی موجود تھیں بلکہ اکثریت انہی کی تھی۔

فرید نے آخر کہا۔

معذرت خواہ ہوں بھابی صاحبہ اور تمام خواتین سے بھی معافی کا خواستگار ہوں۔

جاوید نے مسکرا کر اپنی بیوی سے کہا۔

اچھا صفیہ! ہم لوگ تمہارا کمرہ خالی کر کے باہر برآمدے میں جا کر بیٹھتے ہیں۔ اب تم اور تمہاری مہمان اندر خوب اودھم مچا سکتی ہیں۔

سب مرد ہنستے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور باہر چلے گئے۔ ان کے اٹھتے ہی جانئے اس کمرے میں جیسے پریاں تھرکنے لگیں۔

ایک افسر نے جاوید کے جاوید کے نظریئے کے جواب میں کہا۔

مگر اس معاملہ میں بہت سے پولیس افسر دھوکا کھا سکتے ہیں۔

فرید نے کہا۔

یہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ میرے نظریئے پر وہی پولیس والا پورا اُتر سکتا ہے جس کا مشاہدہ بہت وسیع ہو۔ اور جو انسان کی نفسیات کو اچھی طرح سمجھتا ہو۔ یہ میں مانتا ہوں کہ بہت سے مجرم اتنے قوی اوسان اور اعصاب کے مالک ہوتے ہیں کہ جرم کر آنے کے بعد بھی ان کی کسی حرکت سے گھبراہٹ نمایاں نہیں ہوتی مگر ایک چیز یقینی ہے۔ مثلاً ایک شخص نے کسی آدمی کو اس طرح قتل کیا کہ وہ کسی کی نگاہ میں نہیں آ سکا۔ اب وہ قتل کے بعد اطمینان سے کہیں چھری دھوتا ہے۔ ہاتھوں سے خون صاف کرتا ہے۔ کپڑے بدلتا ہے اور پھر اطمینان سے آپ کے اور ہمارے درمیان چل پھر رہا ہے۔ ہوٹلوں میں چائے پی رہا ہے۔ سینما دیکھ رہا ہے۔ تماشہ بینی اور معاشقہ جوئی وغیرہ اسی طرح کرتا پھر رہا ہے جیسے دوسرے غیر مجرم

لوگ لیکن یاد رکھئے۔ اس کی آنکھوں کے لینس سے دماغ کے کیمرے میں پہنچے ہوئے قتل کی تصویر ہر وقت تازہ رہے گی۔ وہ مٹ ہی نہیں سکتی۔ خواہ وہ کتنے ہی قوی اعصاب والا انسان ہو۔ یہ قدرت کا نظام ہے۔ اب یہیں ایک باریک بین پولیس والے کو قاتل کے دماغ میں اس کے ہاتھ کے قتل کی تصویر متحرک کرنی ہے۔ ایسے قاتل کی باریک نشانیاں یہ ہیں کہ اسے ہنسانے پر دل سے ہنسی نہیں آتی بلکہ وحشیانہ ہنسی آتی ہے۔ اس کی باتوں سے ایک ضبط کیا ہوا خوف ظاہر ہوگا اور اس کی چال ڈھال سے ڈرے کھویا ہوا پن۔ اس میں بھی خوف کا جزو نظر آئے گا۔ بیشک وہ گھبرا کر اپنے گرد و پیش نہیں دیکھ رہا ہوگا لیکن اپنے گرد و پیش میں دلچسپی سے ضرور خالی ہوگا۔

جاوید نے مسکرا کر کہا۔

اچھا چائے کا دور چلے۔

سب لوگ چائے میں مصروف ہو گئے۔

عبید جس قدر تیز لڑکا تھا اتنا ہی خطرناک بھی تھا کیونکہ اس کی پرورش و تربیت ایسے ہی گھرانے میں ہوئی تھی جس کا مقصد حیات ملک، قوم اور وطن کی قیمت پر پلنا تھا۔

اس ایک ڈیڑھ سال کے عرصہ میں یعنی صفیہ کے اگلے شوہر کے حادثۂ قتل کے بعد سے اب تک عبید کے وطن فروش والد اور اس کے مجرم ساتھیوں نے لاکھوں روپے کا مال اور سونا اسمگلنگ کے ذریعے ادھر سے ادھر کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ لائسنسوں کی چوری اور بلیک مارکیٹ کا دوسرا

کاروبار علیحدہ چل رہا تھا۔

ایک عہد کے سماج دشمن والد خان بہادر کریم ہی پر کیا موقوف تھا۔ تقریباً پورا ملک اور تمام تجارت بلیک مارکیٹ کی منڈی میں تبدیل ہو گئی تھی۔

صنعت و حرفت اور انڈسٹری کا یہ عالم تھا کہ وہ ٹیپی سیٹھ لوگوں نے کپڑے، لوہے، ہتھیلی اور دیگر روزمرہ کی استعمال کی اشیاء کے چھوٹے چھوٹے کارخانے اور مل کھول رکھے تھے۔ تاکہ ملک میں ہر دم مانگ کے مقابلہ میں مصنوعات کی قلت رہے اور اس قلت سے فائدہ اٹھا کر مالکان مل اور کارخانے والے من مانے داموں میں اشیاء فروخت کریں۔

جب تک ایک چیز کی قیمت کم از کم بیس بلکہ بعض حالات میں پچاس اور سو گنا وصول نہیں کی جاتی۔ ان کا کام نہیں چلتا تھا۔ اس لئے کم منافع کے کاروبار کو تجارت ہی نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ یہ ٹٹ پونجیے پن سے تعبیر کیا جاتا تھا۔

اس نفع خوری اور بلیک مارکیٹ میں خود حکومت شامل تھی۔ کوئی پارٹی کاگ ماری میں غدارانہ جلسے کر کے اور ریزولیشن پاس کرنے کے بعد ملک کے مشرقی حصے کو سرحد پار والی

حکومت کے سپرد کرنے کی سازش میں لگی ہوئی تھی کسی پارٹی نے پختونستان کا ڈھونگ کھڑا کر کے وطن کے شمال مغربی حصے کو دوسرے ملک کے حوالے کرنے کی سازشیں کر رکھی تھیں۔

کوئی پارٹی متحدہ بنگال بنا کر جنوبی ہند کی کمیونسٹ سٹی میں ملک کا حصہ مدغم کرنا چاہتی تھی۔ کسی نے ملک کی وفادار فوج میں انتشار پھیلانے کی خطرناک تحریک اٹھا رکھی تھی۔

جس زمانے میں اس بے آئین ملک کا آئین پاس ہونے کے لئے پیش کیا جا رہا تھا تو مخالفین نے ایسی ایسی ملک دشمنی سے بھری ہوئی اور غدارانہ تقریریں کی تھیں کہ یہ معلوم ہوتا تھا گویا مہا سبھائی بول رہے ہیں۔

یہ سب کچھ جمہوریت کے نام پر ہو رہا تھا۔ جمہوریت نام کی حیثیت سے بہت خوش آئند چیز ہے مگر عمل کے باب میں بالکل فیل۔ مجھے بتایا جائے کہ دنیا کے کس ملک میں مکمل جمہوریت ہے۔ کیا امریکہ میں، برطانیہ میں، فرانس میں؟ اگر یہی جمہوریت ہے کہ امریکہ میں انڈین اور برطانیہ میں سیاہ فام اقلیت کے ساتھ ناروا سلوک کیا جائے اور ان دونوں ملکوں اور تاریک

ہندوستان کی جمہوریت میں کیا فرق ہے جہاں اچھوت اور مسلمانوں کو ادنیٰ شہری حقوق ملنا تو کجا، سال میں کئی بار بیدردی سے قتل کیا جاتا ہے اور لوٹا جاتا ہے۔

تمام دنیا میں جمہوریت کے نام پر انارکی چل رہی ہے۔ برصغیر ہند و پاک میں تو جمہوریت کا اس وقت نام ہی نہیں لینا چاہیئے۔ جب تک ان ملکوں میں پچاس بلکہ ساٹھ فی صدی تعلیم یافتہ لوگ نہ پیدا ہو جائیں۔

غرض اس بدقسمت ملک میں ایک طرف اسمگلنگ، چور بازاری، اقتدار پرستی، قتلِ عوام کی گرم بازاری، خودغرضی کا دور دورہ تھا تو دوسری طرف اقتدار کی کرسیوں پر سے غداری، استبداد، صوبائیت، غیر ذمہ دارانہ افعال اور اقربا پرستی چل رہی تھی۔ تیسری جانب بھانت بھانت کی سیاسی پارٹیوں نے ملک کو پیس ڈالا تھا۔

افراد کی ذہنیت کا بھی یہی عالم تھا۔ ہر شخص ذاتی غرض، نفع جوئی، سازشی طبیعت اور بے ایمانی وغیرہ کا شکار تھا۔ کیسی حسِ شہریت اور کہاں کا باہمی تعاون۔ وحشیوں کی بستی! غولِ بیابانی!!

اس کا لک ہی کسی کا لباس بے داغ نہ رہا تھا۔ کثیر آبادی کے چہرے ہی نہیں دل تک سیاہ ہو گئے تھے۔ بس شقاوت اور بربریت ہی ان کی زندگی کا شکار تھا۔

ادھر یہ علمائے دین کے امین ہیں، ان میں سے بہت سے گندی حکومت کی آستانہ بوسی کر رہے تھے۔ بہت سے سیاست میں گھس پڑے تھے۔ اس کے بعد نہ دین کے رہے نہ دنیا کے۔

ان عظیم اور انتہا درجہ کے بگڑے ہوئے حالات میں کب کسی معجزے کے ظہور کی امید ہوا کرتی ہے۔ معجزے کا ظہور خود قوم کے ہاتھ میں ہوتا ہے مگر قوم مر گئی تھی۔ حکومت سڑ چکی تھی اور ملک سو رہا تھا۔

افق کے چاروں کونے تاریک تھے لیکن انہی چاروں کونوں میں سے ایک پانچواں کونا پیدا ہوا جس میں سے کبھی کبھی نورانی شعاعیں نکلنے لگتی تھیں مگر یہ شعاعیں ابھی دور تھیں۔

جاوید جیسے بے بضاعت شخص کی کیا حقیقت تھی کہ اس بحرِ ظلمات کو پار کر سکتا۔ وہ اور اس کا ناتواں بچہ فرید بس اندھیرے میں ٹپٹوئیاں مار کر رہ جاتے تھے۔

ایک روز جاوید نے فرید سے کہا۔
فرید! تم اپنی خدمات کے دائرے کو محدود کر لو تو
اچھا ہے۔
فرید نے دریافت کیا۔
کیوں ماموں؟
جاوید نے جواب دیا۔
کیونکہ یہ ناسپاس ملک تم جیسے افراد کا متحمل نہیں ہو سکتا۔
ممکن ہے تمہیں کوئی گزند پہنچ جائے۔
جوانمرد و محب وطن فرید نے کہا۔
اگر ایسا ہوا تو یہ میری معراج ہو گی۔
صفیہ مسکرا کر بولی۔
تم سے پہلے بھی جھوٹی نبوت کا بہت سے لوگ دعویٰ
کر چکے ہیں۔
شمی نے ہنسی سے کہا۔
آپ لوگ نامعلوم کیوں فرید صاحب کو اس قدر اہمیت
دینے بیٹھ جاتے ہیں۔
جاوید و صفیہ اس کے کلمات سے ہنسنے لگے۔

فرید نے کہا۔
ٹھیک تو کہہ رہی ہیں ششی۔
عفیفہ نے اپنی لڑکی سے کہا۔ وہ خاموش ہو گئی۔
ششی! تم فرید میاں کے متعلق آخر ایسے کلمات کیوں کہہ دیا کرتی ہو۔
فرید نے کہا۔
نکتہ چین لوگوں کو تو میں اپنا محسن سمجھتا ہوں۔
جاوید مسکرا کر بولا۔
غالب بے چارہ نکتہ چیں ہے غم دل کہتا ہوا مر گیا۔
فرید نے کہا۔
نہیں ماموں! غالب اب تک زندہ ہے اور اقبال بھی ہمیشہ زندہ رہے گا۔
ششی نے کہا۔ یہ بھی فرید سے خفگی کا دوسرا پیرایہ تھا۔
جو شخص شاعر پرست ہو، وہ کوئی قومی خدمت نہیں کر سکتا۔

صفیہ و جاوید مسکرانے لگے اور فرید کچھ کھسیانا سا
ہو گیا۔

فرید کے باب میں جس شبہ کا اظہار جاوید نے کیا تھا۔ وہ بے بنیاد نہ تھا۔ جاوید کو کچھ دن ہوئے اطلاع ملی تھی کہ سماج دشمن عناصر شب و روز چند محبِّ وطن افراد کے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں۔ ممکن تھا کہ موقع نکال کر وہ اچھے شہریوں کو زک پہنچانے میں کامیاب ہو جائیں۔

اچھے شہری محبِّ وطن افراد میں فرید بھی شامل تھا اور اس کا ایک سب سے بڑا دشمن تو اس کا دو تین سال پیشتر کا دوست عابد ہی تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی نامعقول لوگ

موجود تھے جنہیں خواہ مخواہ فرید سے بغض ہو گیا تھا۔

ایک روز فرید بازار میں جا رہا تھا کہ شورلٹ کار اس کے قریب سے گزری اور آگے جا کر رک گئی۔ پھر اس میں سے عبید اُترا۔

عبید نے حقارت سے ہنستے ہوئے فرید سے کہا۔

ادہو فرید! اب تک ویسے ہی جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہو۔ کار تو کجا بائیسکل تک خریدنے کی توفیق نہیں تمہیں۔

فرید نے جواب دیا۔

ہاں کیونکہ نہ تو میں بلیک مارکیٹ کرتا ہوں نہ میرے والد۔

عبید نے بیہودگی سے کہا۔

تو پھر تم اور تمہارے والد گداگری پر گزارہ کرتے ہوں گے۔

بات غصہ کی تھی مگر فرید نے بڑے ضبط سے کام لیا۔

فرید نے اتنا ہی کہنے پر اکتفا کیا۔

بہرحال ایک گداگر بھی کسی سماج دشمن شخص سے اچھا ہوتا ہے۔

عبید نے کہا۔

جنہیں تم سماج دشمن سمجھتے ہو۔ انہی کے ٹکڑوں پر تمہاری پرورش ہو رہی ہے۔ خیر چھوڑو۔ آؤ چل کر سامنے کے ریسٹورنٹ میں چائے پئیں۔

فرید نے کہا۔

نہیں مجھے کئی کام ہیں۔

عبید نے کہا۔

تمہیں معلوم ہے فرید کہ میں جلد باہر کے ملکوں میں جانے والا ہوں۔

فرید نے کہا۔

مبارک ہو۔ میں خود اگلے ماہ تک باہر کے ممالک کی سیاحت کو جا رہا ہوں۔

عبید نے طنزیہ پوچھا۔

اتنے پیسے ہیں تمہارے پاس؟

فرید نے جواب دیا

مطمئن رہو۔ تم سے قرض نہیں لوں گا۔

عبید نے جھوٹا احسان جتاتے ہوئے کہا۔

تم دو تین سال پہلے تک مجھ سے قرض لیتے رہے ہو۔

فرید نے اپنی معافی کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔
یہ تمہارا ضمیر ہی جانتا ہو گا کہ میں نے تم سے کبھی ایک پیسہ بھی قرض لیا۔ تم ہی نے ایک دفعہ نمائش میں کسی خاتون کی جیب کتر کر پیسے اڑائے تھے۔
عبید نے تلخی سے ہنس کر کہا۔
آہا! وہ واقعہ یاد ہے تمہیں؟
اس دفعہ فرید نے شمی کا ذکر کیا۔
مجھے وہ واقعہ بھی یاد ہے کہ تم نے اسی معزز خاتون کی عفیف و نوعمر لڑکی کے سفیہانہ اغوا کی ناکام کوشش بھی کی تھی۔
عبید نے شمی کے متعلق کہا۔
اوہ! وہ کتنی مستِ شباب لڑکی تھی۔ نام بھی بھول گیا اس کا کیونکہ اب میرے قدم قدم پر ایک سے ایک حسین لڑکی ہے۔ پھر بھی اگر کبھی موقع لگا تو اس لڑکی کو اپنی آغوش میں گھسیٹ کر رہوں گا۔
شمی دو سال سے فرید کی جانِ آرزو بنی ہوئی تھی ہر چند۔ وہ بر بنائے مغالطہ اب تک اس سے خفا تھی مگر یہ تسکین بھی اپنی

جگہ کم نہ تھی کہ حسین شمی اب اس کے لئے غیر نہیں رہی کیونکہ اس کی والدہ فرید کے ماموں کی بیوی تھی۔

مگر شمی کے متعلق عبید سے ایسے بیہودہ کلمات سن کر فرید کو حرارہ آئے بغیر نہ رہا۔

فرید نے کہا۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ اپنی دوسری ناکام کوشش میں تم کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑیں۔

عبید بولا۔

کیا خیر سے آپ کو اس لونڈیا سے کچھ دلچسپی ہو گئی تھی۔ کیوں موت آئی ہے تمہاری؟

فرید نے کہا۔

میں نیکی کی تبلیغ میں ہزار بار مرنے کو تیار ہوں۔

عبید نے کہا۔

اچھا! تو یہ تمہاری آرزو چند ہی روز میں پوری ہو جائے گی۔ گھبراؤ نہیں۔ تین چار دن ہی میں تم اپنی اس مراد کو پا لوگے۔

فرید نے کہا اور تاکہ مزید تلخ کلامی کی نوبت نہ جائے وہاں سے چل دیا۔

عبید نے اس کے پیچھے ایک قہقہہ لگایا اور اپنی غنڈہ پارٹی سے آملا۔

یہ صحیح تھا کہ فرید اگلے ہی ماہ مزید تعلیم کے لئے باہر جا رہا تھا۔ اس کے پچاس فیصدی اخراجات اس کے والدین برداشت کرنے کو تیار تھے پچیس فی صدی امداد دینے کا وعدہ جاوید نے کیا تھا۔ بقیہ پچیس فی صدی اخراجات خود فرید تعلیم کے ساتھ باہر کے ملک میں کچھ کام کر کے پورے کرنے کا ارادہ کر چکا تھا۔

عبید کی دھمکی کو فرید نے زیادہ اہمیت نہ دی مگر مکان پر آکر سوچا کہ اگر عبید جیسے آمادہ شر غنڈے کو عین بحالت شر و فساد گرفتار کرا دیا جائے تو یہ سماج کی ایک خدمت ہو گی۔ یہ سوچ کر فرید دوسرے روز سہ پہر کو جاوید کے مکان پر پہنچا تاکہ اس کے کان میں ڈال دے کہ شیطان طینت عبید اور اس کی سیاہ کار جماعت پر ہاتھ ڈالنے کا موقع آ گیا ہے۔

فرید نے کمرے میں آ کر کہا۔

بھائی جان آداب! کیا ہو رہا ہے؟

مگر جو جسم میز پر جھکا ہوا تھا وہ صفیہ کا نہ تھا بلکہ سشی کا مرغنا طیسی بدن تھا۔ ماشاء اللہ اس کا ڈیل ڈول اور بدن کس قدر

سڈول ہو گیا تھا۔
اس کی آواز پر شمی نے سر اٹھا کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔
فرید نے کہا۔
اوہو! آپ ہیں۔ کیسا مغالطہ ہوا ہے مجھے۔ ممانی کہاں ہیں؟
شمی نے حسب معمول عدم دلچسپی سے جواب دیا۔
ابھی ابھی باہر گئی ہیں۔
فرید نے پوچھا۔
اور ماموں کہاں ہیں؟
شمی نے کہا۔
وہ ابھی امی کے ساتھ گئے ہیں۔
فرید نے کہا۔
خیر پھر آؤں گا۔ ان سے کام تھا ذرا۔
شمی بولی۔
اگر کوئی ضروری کام تھا تو کہہ جائیے۔
فرید نے کہا۔
ایسا کوئی ضروری کام تو نہ تھا۔ پھر بھی اس کی اہمیت سے

انکار نہیں۔

ضروری کام بھی نہیں۔ پھر بھی اہمیت سے خالی نہ تھا۔ فرید کا یہ فقرہ شمی کی سمجھ میں نہیں آیا۔

فرید نے کہا۔ شمی خاموشش کام کرتی رہی۔

اچھا لایئے لکھ جاؤں۔ ممکن ہے آپ کو یاد نہ رہے۔

فرید نے کہا۔

کیا آپ کوئی کاغذ دیں گی؟

شمی نے بیدلی سے کہا۔

اس کاپی سے پھاڑ لیجئے۔

فرید نے دریافت کیا اور الماری کی طرف بڑھا۔ وہاں کچھ سامان بندھا ہوا نظر آیا۔

کاپی آپ کے کام کی تو نہیں؟

فرید نے بندھا ہوا اسباب دیکھ کر دریافت کیا۔

اوہو! کیا کوئی مہمان آیا ہوا ہے؟

شمی نے مختصر سا جواب دیا۔

نہیں۔

پھر یہ اسباب کس کا ہو سکتا ہے۔ کیا ماموں کہیں دورے

پر جا رہے ہیں؟

ششمی نے اس بار بھی صرف نہیں سے کام لیا۔

نہیں۔

فرید سوال کئے جا رہا تھا۔

ممانی کا ارادہ ہے کہیں جانے کا؟

شمی نے آخر کہا۔

کوئی نہیں جا رہا ہے۔ میں جا رہی ہوں۔

فرید نے اپنا سلسلہ جاری رکھا۔ اس دفعہ ششمی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

آپ؟ لیکن کیوں اور کہاں؟

فرید نے قیاس سے کام لیتے ہوئے کہا۔

اچھا سمجھ گیا۔ تعطیلات گزارنے کہیں باہر جا رہی ہو۔

شمی خاموش بیٹھی رہی۔ کیا وہ اس سے بات کر کے اس کی خوش نصیبی میں اضافہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔

فرید نے کہا۔

کاش! میرے پاس بھی اتنی فرصت ہوتی کہ کہیں باہر جا سکتا۔

پھر شمی کی کاپی سے کاغذ پھاڑ کر جاوید کے نام یہ رقعہ لکھنے بیٹھ گیا۔

ماموں جان!

آج شام کو بازار میں مجھے عبید ملا تھا۔ یہ وہی غنڈہ شخص ہے جس نے سال ڈیڑھ سال قبل شمی کا اغوا کرنا چاہا تھا۔ اس نے آج بزدلانہ دھمکی دی تھی کہ قتل کرا دے گا۔ مجھ پر اس کی دھمکی کا کوئی اثر نہیں ہے۔ میں تو آپ کے علم میں صرف یہ لانا چاہتا ہوں کہ عبید اور اس کا اسمگلر والد اور ملک کے دشمن اس کے ساتھی بہت حد تک بڑھتے جا رہے ہیں۔ اس لئے ان کے خلاف جلد کارروائی کرنے کی ضرورت ہے۔ میں خود آپ سے تفصیل بیان کرتا مگر ہفتہ عشرہ کے لئے سخت مصروف ہوں۔ اس لئے نہیں آسکوں گا۔

فرید نے اسے رقعہ دیتے ہوئے کہا۔

لو بھئی شمی! یہ رقعہ ماموں جان کو دے دینا۔ بھولو گی

تو نہیں؟

شمی نے کہا۔

ان کی میز پر رکھتے جایئے۔

شمی پر فرید ایک حسرت کی نظر ڈال کر رخصت ہوا۔

فرید کے جانے ہی شمی نے اس کا لکھا ہوا رقعہ اٹھا لیا اور پڑھنے لگی ختم کرنے کے بعد اسے کچھ تعجب سا ہوا۔ یہ کیا؟ عبید تو فرید کا دوست تھا۔ اب دونوں میں دشمنی کب سے ہو گئی اور ایسی دشمنی کہ وہ ذلیل عبید اپنے شریک کار فرید کی جان کا لاگو ہو گیا۔

اب اسے سوچتے سوچتے کچھ شک ہوا کہ اس کے اغوا میں کیا واقعی فرید بھی عبید کا شریک کار تھا۔ یہ ان کی کیسی دوستی تھی کہ ایک دوسرے کے راز دار ہوتے ہوئے بھی باہم دشمن

ہو گئے۔

ہو گا کچھ۔ شمی نے اس مسئلہ میں نہ الجھنا چاہا اور تعطیلات منانے کے لئے اپنی خالہ کے پاس سومر جانے کی تیاری کرنے لگی۔ سومر یہاں سے ڈیڑھ سو دو سو میل دور ایک سرسبز قصبہ تھا۔

فرید کے جانے کے آدھے گھنٹے بعد ہی صفیہ و جاوید مکان میں آگئے۔ مگر جاوید بہت عجلت میں معلوم ہوتا تھا صفیہ کو مکان پر چھوڑتے ہی پھر اسی وقت باہر چلا گیا۔

شاید رات کو جاوید نے فرید کا رقعہ پڑھا ہو گا مگر جاوید ان دنوں ایسے خطرناک کیس میں اُلجھا ہوا تھا کہ ان کے مقابلہ میں اس نے فرید کے رقعہ کو زیادہ اہمیت نہیں دی، اپنے دوسرے کاموں میں مصروف ہو گیا۔

کھانے پر جاوید نے اس سے دریافت کیا۔

کیا شمی تم کل ہی سومر جانا چاہتی ہو؟

شمی بولی۔

جی ہاں! ارادہ تو کل ہی روانہ ہونے کا ہے۔ کیا آپ مجھے سومر تک چھوڑنے نہیں چلیں گے؟

جاوید نے پوچھا۔

ضرور چلتا مگر میں چند اہم کاموں میں پھنس گیا ہوں۔ کیا تم پانچ چھ روز توقف کر سکتی ہو؟

شمی نے کہا۔

مگر میں خالو ابا کو تار دے چکی ہوں۔ وہ پرسوں اسٹیشن پر مجھے لینے آئیں گے۔

صفیہ اپنی لڑکی سے بولی۔ وہ چپ ہو گئی۔

تمہاری روانگی کے التوا کا انہیں تار دیا جا سکتا ہے۔

اسے خاموش پا کر جاوید نے کہا۔

اپنا دل نہ مارو۔ اچھا میں اپنا اردلی تمہارے ساتھ کر دونگا وہ تمام سفر میں تمہیں آرام پہنچائے گا۔

شمی تشکرانہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

صفیہ نے مسکرا کر کہا۔

تعطیلات کے بعد میں نے اکثر دیکھا ہے کہ طلباء کیمپ سے باہر جانے کے لئے بے چین ہونے لگتے ہیں۔

شمی نے کہا۔

ہاں امی! پھر گھر میں جی نہیں لگتا۔

غرض دوسرے روز صبح کی گاڑی سے شمی جاوید کے

اردلی کی نگرانی میں سومر روانہ ہوگئی۔ اسے خوشی تھی کہ مہینے ڈیڑھ مہینے کے لئے درسی کتب سے نجات مل جائے گی اور وہ قصبات کی کھلی آب و ہوا کا لطف لے سکے گی۔

شمی کے دل میں کسی کا خیال نہ تھا کیونکہ وہ عشق و محبت کی عام لغویات میں مبتلا ہونے والی لڑکی نہ تھی۔ اس کے برعکس خودسر، رکھ رکھاؤ والی اور حقیقت آشنا لڑکی تھی۔

سفر میں ایک دو بار شمی کو خیال تو آیا کہ تعجب تھا کہ فرید کے رقعہ کو جاوید نے اہمیت نہیں دی۔ حالانکہ خود شمی کو وہ رقعہ توجہ کا سزاوار ہو رہا تھا۔ ابّا زیادہ سمجھتے ہیں ان معاملات کو۔ ممکن ہے۔ عبید اور اس کی شیطانی پارٹی کے خلاف وہ کوئی قدم اٹھا چکے ہوں۔ شمی نے سوچا۔

شمی کی روانگی کے تیسرے روز شام کو صفیہ و جاوید چائے پی رہے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ جاوید اٹھ کر گیا۔ وہ ہر لمحہ شہری حالات سے باخبر رہنا چاہتا تھا۔

تین چار منٹ کے بعد وہ ٹیلی فون کے پاس سے آیا تو سخت مضطرب نظر آ رہا تھا۔

صفیہ نے جلدی سے پوچھا۔

خیریت تو ہے؟

جاوید نے تشویش سے جواب دیا اور جلد جلد کپڑے پہننے لگا۔

فرید کو کسی نے سخت زخمی کر دیا ہے اور وہ شفاخانہ میں ہے۔

صفیہ نے انتہائی پریشانی سے دریافت کیا۔

اے خدا! کس نے؟

جاوید نے کہا اور جانے لگا۔

اب یہ تو وہیں جا کر معلوم ہوگا۔

صفیہ بولی۔

ٹھہریئے! میں بھی چلتی ہوں۔

اور جس لباس میں تھی اسی میں اپنے شوہر کے ساتھ ہولی۔

دونوں جیپ میں روانہ ہوئے۔

راہ میں جاوید نے اپنی بیوی سے کہا۔

یہ میری غفلت کا نتیجہ ہے۔

اچھا! کس طرح؟

جاوید نے کہا۔

تین چار روز ہوئے فرید مکان پر آیا تھا تو ایک رقعہ لکھ گیا

تھا۔ اس میں تحریر کیا تھا کہ عبید نے اسے دھمکی دی ہے جس کی اس نے پرواہ نہیں کی۔ میں بھی اپنے دوسرے اہم معاملات میں اسے کوئی اہمیت نہ دے سکا۔ آخر بدمعاش اپنا کام کر گئے۔

صفیہ نے غصے سے کہا۔

آپ اسی وقت اس ذلیل چھوکرے کو پکڑ کیوں نہیں لیتے۔

جاوید نے کہا۔

وہ چھوکرا نہیں ہے۔ دوسرے اس کا باپ ہمارے کئی وزیروں کا خاص آدمی ہے۔ تیسرے اس کے خلاف میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔

جاوید پر غائبانہ حملہ کیا گیا تھا۔ شاید اس کے نیک اعمال کام آ گئے تھے کہ بچ گیا۔ بہر حال اس کے شدید زخم نہیں آیا۔ مگر جس سپاہی نے فرید کے عازم قاتلوں کو پکڑنے کی کوشش کی تھی وہ سخت زخمی ہوا تھا۔ کیونکہ پکڑے جانے کے خوف سے قاتل فرید کو چھوڑ کر سپاہی پر ٹوٹ پڑے تھے اور اس کے بعد بھاگ گئے تھے۔

صفیہ نے مسکراتے ہوئے فرید سے کہا۔

شکر ہے کہ تم زیادہ زخمی نہیں ہوئے۔ میں تو گھبرا گئی
تھی۔
جاوید نے کہا۔
تمہارے حادثہ میں کچھ میرے تغافل کو بھی دخل ہے
فرید۔
فرید نے مسکرا کر کہا۔
کچھ نہیں ماموں جان۔ کوئی خیال نہ کیجئے۔
جاوید نے دریافت کیا۔
کیا تم ان بدمعاشوں کو پہچانتے ہو؟
فرید نے جواب دیا۔
نہیں آج سے قبل میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا تھا۔
صفیہ نے پوچھا۔
تم انہیں پہچان تو سکو گے؟
فرید نے جواب دیا۔
یہ بھی ذرا مشکل ہے کیونکہ انھوں نے پیچھے سے حملہ کیا
تھا اور اسی وقت بھاگنے لگے تھے کہ سپاہی نے ان کا پیچھا کیا
اور میں اپنے زخم کی وجہ سے تیورا گیا تھا۔

جاوید نے کہا۔
بہر حال عبید نے اپنی دھمکی سچ کر دکھائی۔ یہ بات دوسری ہے کہ وہ لقبضہ تمہاری جان لینے میں کامیاب نہ ہوا۔
فرید نے کہا۔
کیا کہا جائے مگر معلوم کچھ ایسا ہی ہوتا ہے لیکن عبید کی دھمکی کا نہ میرے پاس کوئی ثبوت ہے اور نہ آپ کے پاس۔
جاوید نے کہا۔
یہی تو مشکل ہے۔ خیر دیکھو میں تحقیق کروں گا۔
صفیہ بولی۔
مفت میں بیٹھے بٹھائے وہ ذلیل انسان ہمارا دشمن ہو گیا ہے۔
جاوید نے کہا۔
وہ صرف ہمارا یا فرید ہی کا دشمن نہیں ہے بلکہ پوری قوم و ملک کا دشمن ہے۔
صفیہ نے فرید کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔

خیر تم ہمت سے کام لو۔ انشاءاللہ جلد اچھے ہو جاؤ گے۔

فرید نے کہا۔

میں ایسی چوٹوں اور زخموں کی پرواہ کبھی نہیں کرتا۔

آخر چند منٹ بعد اس کی معافی اور ماموں رخصت ہو گئے۔

دو سال پہلے شمی کے اغوا کی کوشش صفیہ کے شوہر کا قتل اور خود صفیہ کا اغوا اور اب فریدہ کو موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش وغیرہ یہ اس وحشی ملک کے آئے دن کے واقعات تھے۔ روزانہ نامعلوم کتنے لوگ قتل ہوتے تھے، لٹتے تھے اور نہ جانے کتنی عورتوں کی عصمت برباد ہوتی تھی۔

یہی مظالم تقسیم سے قبل اور زمانۂ تقسیم ملک غیر مسلمین کے ہاتھوں ہم پر توڑے جاتے تھے تو ہم چیخ پڑتے تھے لیکن انہی تاریخی باتوں کا اعادہ جب اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں ہو رہا ہے تو ہم

اس کا تدارک کرنا تو کجا اُلٹے قاتلوں، ڈاکوؤں، چوروں اور زناکار لوگوں کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں اور ملکی قانون، قانون مذہب قانونِ شہری اور قانونِ انسانیت کو پیروں میں کچل رہے ہیں۔

ان انسانیت سوز افعال کی روک تھام کے لئے ہمیں نڈر اور بہادر نوجوانوں کی ضرورت ہے جو اپنی جان کی بازی لگا کر ایسے جرائم کو روکیں۔ امریکہ اور روس میں راکٹ کے ذریعہ چاند تک پہنچنے کے لئے وہاں کے مردانِ اولوالعزم کیٹیو بنا رہے ہیں ہر شخص چاہتا ہے کہ چاند کے تجرباتی سفر میں (جس کا انجام یعنی موت ہے) وہ کام آئے۔ کیا ہمارے ملک کے جوانمرد خطرناک وطن سوز جرائم کی انسداد کے سلسلہ میں لا ئیمن نہیں لگائیں گے تاکہ ایسے نیک کاموں میں ان کی جان تک چلی جائے تو پرواہ نہیں۔

فرید پندرہ بیس روز میں بالکل اچھا ہو گیا اور مکان پر آگیا۔ اس کے بعد حسب معمول بلا جھجک شہر کے بازاروں اور گلی کوچوں میں چلنے پھرنے لگا۔

صفیہ نے کہا۔

میرا خیال ہے فرید کہ تم برائے چندے آزادی سے نہ پھرو۔

فرید نے مسکرا کر کہا۔

کیا پردہ میں بیٹھ جاؤں؟

صفیہ بولی۔

میرا مطلب یہ ہے کہ باہر نکلنے میں ذرا احتیاط سے کام لیا کرو۔

فرید نے کہا۔

میری سستی زندگی ختم کرنے سے کسی کو کیا مل جائے گا معافی۔ اس کے علاوہ اگلے ہفتے میں تو باہر کے ملکوں میں جا رہا ہوں۔ اب اگر کسی نے اسی ہفتے مجھے مار ڈالا تو مزید تعلیم کی حسرت دل میں رہ جائے گی۔

جاوید نے مسکرا کر پوچھا۔

کیا اس کے علاوہ تمہارے دل میں کوئی اور حسرت نہیں؟

فرید خاموش ہو گیا۔ پھر بولا۔

فرید نے جواب دیا۔

حسرت تو یوں کہیئے کہ آرزوؤں سے کوئی بستر خالی نہیں۔

جاوید مسکرا کر بولا۔

تمہاری ممانی بھی تمہاری کوئی آرزو جاننا چاہتی ہیں۔

فرید خاموش ہو گیا۔

صفیہ نے دریافت کیا۔

واپسی کتنے عرصہ بعد ہوگی تمہاری؟

فرید نے جواب دیا۔

پانچ چھ سال تو لگ ہی جائیں گے بھابی۔

جاوید نے اپنی بیوی سے کہا۔

یہ تو لمبی مدت ہو گئی صفیہ۔ اپنا نیا پروگرام التوا میں پڑ جائے گا۔

صفیہ بولی۔

ہاں جاوید! تعطیل منانے کے لئے شمی کو اسی زمانہ میں جانا تھا۔

ان کے کنایات کو فرید سمجھ گیا اور اس کا دل ایکدم خوشی سے اچھل پڑا مگر پھر فوراً ہی اس پر یاس طاری ہو گئی کیونکہ وہ آگاہ تھا کہ شمی نامعلوم کیوں اس سے کھچی کھچی سی رہتی ہے۔

جاوید نے کسی خاص کنائے کے ماتحت دریافت کیا۔

کیا فرید تم چند روز اور نہیں رُک سکتے ؟

فرید نے جواب دیا۔

نہیں ماموں! میرا اسباب بُک ہو چکا ہے۔ دوسرے آج سے چودہ پندرہ روز بعد باہر کے کالج کا سیشن شروع ہو جائے گا۔ اس لئے ذرا مجھے وقت سے پہلے ہی پہنچنا ہے۔

اس نے سوچا کہ شمی کی واپسی کے انتظار میں رُکنا بیکار ہے جس خوش فہمی میں اس کے ماموں اور ممانی شمی و فرید کے باب میں مبتلا تھے، اس کا کوئی وجود نہ تھا۔ شمی اس سے گریزاں تھی۔ پھر کیوں وہ اپنا مستقبل برباد کرتا۔ کیوں بے فائدہ کسی موہوم پر جیتا۔

جاوید نے کہا۔

خیر تو سدھارو۔ میری دعائیں اور امداد ہر وقت تمہارے ساتھ ہیں۔

فرید نے کہا۔

خدا آپ کو اور ممانی کو سلامت رکھے۔ مجھے بڑی ڈھارس رہے گی۔

امی کا خیال رکھیں ماموں۔ وہ میری جدائی میں ابھی سے کڑھ رہی ہیں۔

جاوید نے کہا۔

بے فکر رہو۔ میں انہیں ڈھارس دے کر ٹھیک کر لوں گا۔

غرض دوسرے ہفتے ہی فرید باہر کے ملکوں میں تعلیم حاصل کرنے روانہ ہوا اور کوشش ضبط کے باوجود شمی کا خیال بھی ساتھ لیتا گیا۔

B.A. Farooqi

پوری تعطیلات ختم کرنے کے بعد شمی کہیں لوٹی۔ اپنی خالہ کے پاس وہ کافی خوش و خرم رہی تھی اور چھٹیاں اس نے بڑے لطف سے گزاری تھیں، باہر تعطیلات منانے کے پُرلطف وقفہ میں اسے کئی دلچسپیاں مل گئی تھیں۔ مثلاً ایک دو نئی سہیلیاں جن سے اپنے ٹھٹے کی بنا پر اس نے زیادہ بے تکلفی نہیں بڑھائی تھی۔

انہی دلچسپیوں میں اسے اسد بھی مل گیا تھا۔ اسد اس کی حقیقی خالہ کا لڑکا تھا۔ ایم۔ اے کا طالب علم، ہوشیار پھر شمی کا منگا بھی

ویسے شکل وصورت کا بھی برا نہ تھا۔
کہیں تین ساڑھے تین سال بعد شمی اپنی خالہ سے ملنے آئی تھی۔ پہلے وہ تین سال چھوٹی تھی۔ یعنی اس کا حسن وشباب پہلے بقدر سہ سال چھوٹا تھا۔ اب جو آئی تو قیامت بن کر آئی تھی اور اسد کو لوٹ کر جا رہی تھی۔
باوجود اپنے کبر ونخوت کے شمی اسد کے ساتھ رکھائی کے ساتھ پیش نہیں آئی تھی۔ ایک تو وہ اس کی سگی خالہ کا لڑکا تھا۔ دوسرے اس میں شمی کو کوئی برائی نظر نہیں آئی تھی۔ اسی وجہ سے اسد مسرت سے اپنی آرزوؤں کو بار آور ہونے کی توقع کرنے لگا تھا۔
شمی کی روانگی سے چند روز قبل اسد نے اس سے کہا۔
شمی! تم بڑے ناوقت نمودار ہوئیں اور اس سے بھی زیادہ ناوقت جا رہی ہو۔
شمی نے عادتاً تیوری پر بل ڈال کر دریافت کیا۔
کیوں؟
اس کی ایسی چتون کی تاب لانا غریب فرید کے لئے ناممکن تھا بلکہ ڈیڑھ دو سال قبل جب کہ عبید بدمعاش اس کے ہاں

چند بار آیا تھا تو وہ بھی شمی کے تیوروں سے جھجک جاتا تھا۔

اسد نے اپنے دل کی کیفیت ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

تمہارے آنے کو نا وقت تو میں یوں سمجھتا ہوں کہ تمہاری تشریف آوری نے میرے امتحان کی تیاری کو ضعیف کر دیا۔ اور تمہارے اندر دلچسپی کو بڑھا دیا اور اب جا رہی ہو تو دلچسپی کو یاد سے بدل کر جا رہی ہو۔ تم ہی بتاؤ اب میں امتحان کی تیاری کیسے کر سکوں گا۔

شمی نے جواب دیا۔

جس طرح اب تک آپ تیاری کرتے رہے ہیں۔

اسد بولا۔

مگر تم تو میرا عالم ہی بدل کر جا رہی ہو۔

شمی نے کہا۔

مجھے بہت افسوس ہے

وہ اس کے الفاظ کا مطلب سمجھ گئی تھی۔

اسد نے دریافت کیا۔

اچھا! اگر میں اپنے امتحانات کے بعد تمہارے ہاں

آکر تعطیلات گزاریں تو خوش ہوں گی؟
شمی نے کہا۔
ضرور آیئے۔ خالہ جان سے تو میں وعدہ لے چکی ہوں کہ تین چار ماہ بعد وہ ضرور ہمارے پاس آئیں گی۔
اسد کو بڑی خوشی ہوئی۔
اسد نے کہا۔
بس تو میں انہی کے ساتھ آؤں گا۔ پھر تم مجھے اپنے شہر کی خوب سیر کرانا۔
شمی نے کہا۔
میں سیر سپاٹے تو اپنے شہر میں کبھی نہیں کرتی۔ ہاں البتہ میرے نئے ابا یا فرید بھائی آپ کو خوب سیر کرا دیں گے۔
شمی نے اپنی والدہ کے دوسرے نکاح کا ذکر یہاں شائستگی سے کر دیا تھا جس میں جاوید کی بھی بہت تعریف کی تھی۔ اس کی خالہ کو اپنی بہن کے اگلے شوہر کے قتل کا حال پہلے ہی خطوط کے ذریعہ معلوم ہو چکا تھا اور صفیہ کی بہن نے اپنے خطوں میں اصرار کیا تھا کہ دونوں ماں بیٹی اس کے پاس چلی آئیں مگر صفیہ نے بہنوئی کے ٹکڑوں پر پڑنا گوارا نہیں کیا تھا اور نہ

لیکن شمیم کیا تم مجھ سے وہاں بھی اسی طرح پیش آؤگی جس طرح یہاں آتی رہی ہو یعنی کھنچی کھنچی۔ وہاں تو میں تمہارا مہمان ہوں گا۔

شمی رُک گئی۔

دیکھئے! میں کھنچی کھنچاتی نہیں ہوں کسی سے بلکہ میری عادت ہی یہی ہے کہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اسد نے مسکرا کر پوچھا۔

کہ ہر ایک کو منہ نہیں لگاتیں؟

شمی بولی۔

خیر کچھ ہی سمجھئے۔

اسد نے پوچھا۔

اچھا تو کیا میں بھی ناقابل اعتنا شخص ہوں؟

شمی نے کہا۔

اس سوال کا کیا محل ہے؟

اسد نے کہا۔

محل کون سی بڑی چیز ہے۔ میں تمہارے لئے عالیشان محل تیار کرا دوں گا۔

شمی کو ہنسی آگئی۔ اسد نے محمل کو کس معنی میں استعمال کیا تھا۔

اسد نے مسکرا کر کہا۔

شکر ہے تم ہنسیں۔ اب میں زندہ رہ جاؤں گا۔

اسد کی باتوں سے شمی خفا نہیں ہوئی۔ اگر کوئی دوسرا لڑکا اس سے ایسی باتیں کرنے کی جرأت کرتا تو وہ اس کے پیچھے پڑ جاتی۔ یہی چیز ظاہر کر رہی تھی کہ اگر اسد کو شمی کے ساتھ رہنے کا ذرا زیادہ موقع مل جاتا تو برف پگھل جاتی۔

چلتے وقت شمی کی خالہ بولیں۔

شمی بیٹی! اپنے نئے ابا سے ہماری دعا کہنا۔

شمی نے مسکرا کر کہا۔

اب یہ دعا آپ خود ہی ہمارے ہاں آکر انہیں دینا خالہ جان!

غرض شمی ریل کے ذریعہ اپنے شہر روانہ ہوئی اور اسد کے لئے اپنی یاد کی ٹیسیں چھوڑ گئی۔ شمی

کے دل پر بھی روانگی کے وقت ایک بار سا موجود تھا۔

اپنے شہر کے شمی کو دس بارہ دن ہو گئے لیکن فرید نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اس کا کیوں خیال اور کیوں اس کے متعلق دریافت کرتی کہ کیا بات ہے۔ آج کل فرید بھائی نظر نہیں آ رہے ہیں۔

اس طرح ایک ڈیڑھ ماہ گزر گیا مگر فرید نظر نہیں آیا کہ وہ کہاں غائب ہے۔ اس ظالم لڑکی نے اس ناکردہ گناہ انسان کو محض بدگمانی ہی بدگمانی میں نظروں سے گرا دکھا تھا۔

ایک روز جاوید نے اپنی بیوی سے کہا۔
لو بھئی صفیہ! شکر ہے فرید کا داخلہ ہو گیا۔
صفیہ نے بھی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔
خدا کا شکر ہے۔ کیا خط آیا ہے اس کا؟
فرید کا ذکر چھڑا تو شمی درمیان میں بولی۔
کیا مقامی کسی کالج میں داخل ہونے کی اطلاع خط کے ذریعے دی جاتی ہے؟
جاوید نے مسکرا کر اس سے کہا۔
مقامی کالج! ارے بھئی!! اس کا آکسفورڈ میں داخلہ ہوا ہے۔
صفیہ نے کہا۔
ارے ہاں! شمی کو کیا خبر کہ فرید لندن کیسے چلا گیا ہے۔ یہ یہاں موجود کب تھی اس کی روانگی کے زمانہ میں۔
شمی نے کہا۔
اچھا بھائی فرید جا پہنچے لندن!
اب اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ اتنے عرصہ سے کیوں نہیں آ رہا تھا۔

صفیہ نے کہا۔
اسے گئے ہوئے تو ایک ماہ سے زیادہ ہو گیا۔
جاوید نے کہا۔
شمی کو تو یہ معلوم نہ ہو گا کہ روانگی سے پندرہ بیس روز قبل فریدہ پر کیا حادثہ گزرا تھا۔
صفیہ نے کہا۔
ہاں وہ بھی شمی کی عدم موجودگی میں ہوا تھا۔
فریدہ سے شمی کو کوئی ہمدردی تو تھی ہی نہیں کہ گھبرا کر دریافت کرتی کہ وہ کس حادثہ سے دوچار ہوا تھا۔ بہر حال جاوید کی خاطر اخلاقاً بولی۔
کیا ہوا تھا ابا جان؟
جاوید نے جواب دیا۔
سماج دشمن افراد نے اس کی جان لینا چاہا تھا۔ وہ تو قسمت ہی اچھی تھی کہ بچ گیا ورنہ ان کی نیت تو اسے قتل ہی کر دینے کی تھی۔
صفیہ بولی۔
بچ کیا خاک گیا تھا۔ کافی زخمی ہو گیا تھا۔

شمی نے یاد کر کے کہا۔

اچھا! یہ انہی لوگوں کی دھمکی کا شاخسانہ ہوگا جس کے متعلق بھائی فرید آپ کے نام اس روز ایک رقعہ یہاں چھوڑ گئے تھے۔

اور اس امر سے آگاہ ہونے کے بعد کہ وہ لوگ آخر اپنی دھمکی پوری کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ شمی کو افسوس ہوا۔

جاوید نے کہا۔

ہاں شمیم! افسوس!! میں فرید کے رقعہ کو بھول گیا تھا۔ اس لئے تاعمر تدارک سے قاصر رہ گیا تھا۔

شمی نے کہا۔

مگر ابا جان! وہ دھمکی تو بھائی فرید کو اسی غنڈے عبید نے دی تھی اور پوری کر بتائی۔ آپ اس کی گردن کیوں نہیں ناپتے؟

جاوید نے جواب دیا۔

کیونکہ سوائے فرید کے رقعہ کے ہمارے پاس عبید کی دھمکی کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے

شمی نے کہا۔

واہ! یہ کیا قانون ہے۔ اس طرح تو غنڈوں اور سماج دشمن افراد کے ہاتھوں نہ تو کسی شہری کی جان محفوظ ہے نہ عزت۔

صفیہ نے کہا۔

ہاں نسیم! اپنے ملک میں یہی ہو رہا ہے۔ دیکھو! اس ملک کی قسمت جب جاگتی ہے۔

آج یہ پہلا جملہ تھا کہ اس قتالہ نے فرید کی ہمدردی میں ادا کیا تھا۔

جاوید نے جواب دیا۔

اس کے اور زخم تو بھر گئے تھے مگر بڑا گھاؤ اب بھی کسی قدر ہرا تھا۔ اسے جانے کی جلدی یوں تھی کہ داخلہ کی تاریخ نکلی جا رہی تھی۔

سشی نے دل میں کہا۔

اچھا تو فرید کے متعدد زخم آئے ہوں گے۔ بدمعاش خواہ مخواہ پیچھے پڑے ہوئے تھے۔

اور دفعتہً اسے یاد آیا کہ فرید تو عبید کا دوست تھا اور ہر معاملہ میں اس کا شریکِ کار رہا کرتا تھا۔ وہ کیسا شریکِ کار تھا اور یہ کیسی دوستی تھی کہ عبید اپنی ہی پارٹی کے آدمی کی جان کا

لاگو ہو گیا۔

سمی نے سوچا۔

نہیں ایسا ممکن نہیں۔ یا تو بعد کو عبید و فرید کے درمیان آپس میں بیر ہو گیا ہو گا یا....... یا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ فرید شروع ہی سے کبھی عبید کے شیطنت کا شریک ہی نہ رہا ہو۔

اسے اس کی طبیعت کی حساسی کہئے یا فرید کے بارے میں اپنی رائے کے ازالہ کا ایک ہلکا سا جھٹکا کہ ناشتہ کے بعد سمی اپنے کمرے میں گئی تو خود کو اس نے فرید کے بارے میں ایک معمہ کے اندر الجھا ہوا پایا۔

اسے ایک افسوس یہ بھی ہو رہا تھا کہ جاوید نے فرید کے آگاہ کُن رقعہ کو اہمیت کیوں نہیں دی۔ اگر جاوید اس کی حفاظت میں کوئی قدم اٹھا لیتا تو فرید زخمی ہونے سے بچ جاتا۔

اس کے بعد سمی کے خیالات ایک اور حقیقت کی طرف مڑنے لگے۔ اگر فرید محبِّ وطن افراد میں مقبول اور سماج دشمن عناصر کی نظروں میں کھٹکنے لگا تھا تو اس کے یہ معنی تھے کہ وہ واقعی ایک پُرخلوص انسان تھا اور جو کچھ ملک و قوم کیلئے

کرنے میں لگا ہوا تھا۔ اس میں فی الحقیقت صداقت تھی۔
شمی نے اب تک فرید کی قومی خدمات کو محض ریاکاری کی ایک شق سمجھا تھا مگر ایک ریاکار انسان اپنی جان و مال پر صدمہ آتا دیکھ کر عریاں ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس فرید تو جان کا خطرہ سامنے دیکھ کر بھی اپنے مقصد سے پیچھے نہیں ہٹا تھا۔ یقیناً اس کے ارادے کھوٹ سے پاک تھے۔ اور جو کچھ کام وہ کر رہا تھا خلوص دل سے کر رہا تھا۔ شمی سوچے جا رہی تھی۔
پھر بیٹھے بٹھائے غریب فرید کو ذلیل عبید نے اپنے آدمیوں سے قتل کرا دینا چاہا تھا۔ وہ تو لیا دیا اس کے آڑے آ گیا ہوگا ورنہ اس کی جان جانے میں کیا کسر رہی تھی۔ تاہم بیچارہ اپنے سفر یورپ سے چند روز قبل ہی شدید زخمی کر دیا گیا تھا اور امی سے معلوم ہوا کہ اس کا اب بھی ایک بڑا زخم ہرا ہے۔ شمی فرید ہی کے خیال میں کھوئی رہی۔
یہ دو سال کے پرانے مغالطہ کا ردِ عمل تھا جو آہستہ آہستہ شمی کو چھیڑے جا رہا تھا۔ اب تک وہ فرید کے باب میں کس قدر بدگمانی میں مبتلا تھا۔

مجھے دھوکا ہی ہؤا کہ میں اپنے اغوا میں عبید کے ساتھ ساتھ فرید کا بھی ہاتھ سمجھتی رہی۔ اتنے صادق جذبات والا انسان عبید جیسے سیاہ کار ساتھی نہیں ہو سکتا۔ شمی نے دل میں کہا اور یکایک اسے اختری کا خیال آیا۔ کیونکہ اس کے اغوا کے موقع پر وہاں اختری بھی موجود تھی۔

اختری آگئی تو شمی نے دریافت کیا۔

اختری! تمہیں کچھ یاد ہے کیا کہ جس روز کمینے عبید نے میرا اغوا کرنا چاہا تھا تو اس کے ساتھ اور کون کون تھا۔

اختری نے جواب دیا۔

اب گڑے مُردے کیوں اکھیڑ رہی ہو۔ اس کے علاوہ عبید کے ساتھ سے کیا میں واقف ہوں۔

شمی نے پوچھا۔

اچھا! تمہیں یہ خیال تو ہوگا کہ اس وقت فرید کہاں تھا؟

اختری نے کہا۔

ہاں یہ اچھی طرح یاد ہے کیونکہ فرید ہی پولیس کو بُلا کر لایا تھا۔

شمی کا چہرہ شگفتہ ہو گیا۔

ان تمام حقائق سے آگاہ ہونے کے بعد اور اپنی غلط فہمی کا پردہ چاک ہونے سے شمی پر خود بخود باطنی طور پر ندامت سی طاری ہوگئی۔ حد ہوتی ہے خودسری و بدگمانی کی بھی۔ میں اب تک ناکردہ گناہ فرید کو نگاہ سے گراتی رہی اور دو سال کے بعد میری آنکھیں کھلیں۔ وہ بھی فرید کی جان پر حملہ ہونے کے بعد۔ اس نے سوچا۔

کاش! فرید یہاں موجود ہوتا۔ وہ اپنی نخوت و غرور کو بالائے طاق رکھ کر اس سے معافی مانگ لیتی۔ کیونکہ اس نے بارہا

دانستہ طور پر نہ صرف فرید کی دل آزاری ہی کی تھی بلکہ اس کی توہین کا بھی ارتکاب کیا تھا۔

اس طرح واقعات کے بگولے سے چکر کھاتا ہوا فرید اب شمی کے لئے وجۂ کفارہ بنتا جا رہا تھا۔ بارہا اس نے سوچا کہ فرید کو ایک معذرت نامہ لکھے مگر اس سے کیا فائدہ۔ اب تو جب کبھی وہ یہاں آئے گا۔ اس وقت دیکھا جائے گا۔

یہ شمی کی ایکا ایکی تلملاہٹ، بے چینی کشمکش اور شرمساری دراصل اس کی اپنی ہی فریب کارانہ باطنی کیفیات کا نتیجہ تھی ان کیفیات کو اس نے اپنے سینے میں بڑا گہرا دفن کر رکھا تھا اور خود اس سے کہہ دیا تھا کہ فرید سے نفرت کئے جا۔ کیونکہ وہ تیرے مجرم کا دوست ہے۔

لیکن جب جاوید، صفیہ کا بنا رہا اور ملک کے اچھے لوگ بھی فرید کو اچھا کہنے لگے تو شمی خود کو دھوکا دینے کے لئے اور بھی زیادہ جلنے لگی۔ نہیں وہ بہت برا ہے۔ اسے اچھا کہنے والے سب جھوٹے ہیں۔ وہ جل جل کر دل میں سوچتی مگر اس کے یہ سرد خیالات فی الحقیقت گرم پسندیدگی کے

خلاف بغاوت کی ایک کوشش رہی۔
شمی کی مثال کچھ ایسی تھی جیسے کسی حاسد کے علم میں اتنا آیا ہو کہ محلے کے ایک آدمی کے پاس صندوق میں تھوڑا سا سونے کا زیور پڑا ہے مگر ایک دن یکلخت صندوق کا ڈھکنا اٹھا دیا گیا ہو تو حاسد نے دیکھا ہو کہ یہ صندوق تو زر و جواہر سے بھرا ہوا ہے۔
بہر حال شمی کے لئے بھی اب صندوق کا ڈھکنا اٹھ چکا تھا۔ اور اس نے دیکھ لیا تھا کہ صندوق کے اندر کس قدر مال و متاع موجود تھا مگر افسوس وہ تمام زر و جواہر ولایت منتقل ہو گئے تھے۔ یہاں خالی صندوق رہ گیا تھا۔
فرید مر ہی جاتا تو اچھا ہوتا۔ شمی نے جھلّا کر دل میں کہا۔
وہ فرید کے متعلق اپنی رات دن کی باطنی شرمساری اور ضمیر کی ملامت سے تنگ آ گئی تھی۔ پھر اتنا ہی نہیں ہوا تھا بلکہ شمی کو یہ تڑپا دینے والا بھی انکشاف ہوا تھا کہ فرید کو دل میں برا بھلا کہتے کہتے اس سے جلتے جلتے اس کے متعلق بدگمانی میں پھنستے پھنستے بھی وہ اسے چاہتی رہی ہے۔ کچھ ازالۂ غلط فہمی کے بعد سے نہیں بلکہ شروع ہی سے۔ اتنی

وقت سے جب عابد کے ساتھ فرید پہلی ہی دفعہ صفیہ کے مکان پر آیا تھا۔ اس زمانہ میں شمی اگرچہ پورے طور پر جوان نہیں ہوئی تھی مگر پھر بھی فرید آ کر اس پر سایہ سا ڈال گیا تھا۔

خیر فرید چلا گیا تھا۔ ایک طویل مدت کے لئے گم ہو گیا تھا مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ نائیگرا کا آبشار صدیوں سے جاری ہے مگر اس کا جھرنا آج تک خشک نہیں ہوا۔ فرید کل آئے بار برسوں کے بعد اسے بھلایا نہیں جا سکتا۔

غرض اس طرح شمی کو کشمکش میں مبتلا ہوئے دو ڈھائی ماہ گزر گئے۔ یعنی فرید کی جدائی پر چار ماہ بیت چکے تھے اور وہ اپنی واپسی کا کوئی وقت تعین نہیں کر گیا تھا۔

ناشتہ پر صبح کا اخبار پڑھتے ہوئے جاوید نے کہا۔

آہا! آپ کے غلام بھی چلے ولائیت۔

صفیہ نے پیالی میں چائے لوٹتے ہوئے پوچھا۔

کیا ہوا۔ کون چلے ولائیت؟

جاوید نے مسکراتے ہوئے صفیہ کے سامنے اخبار رکھ دیا۔

یہ لو تصویر دیکھ لو۔ پہچانتی ہو ان بزرگ کو؟

شمی نے پوچھا۔

کون ہے ابا؟

اور وہ بھی جاوید کی کرسی کے پیچھے آکھڑی ہوئی مگر جونہی اخبار والی تصویر پر اس کی نظر پڑی تو نفرت سے منہ بنا کر واپس اپنی جگہ پر آبیٹھی۔

صفیہ نے کہا۔

اوہو! یہ ناشدنی عبید بھی ولائت جا رہا ہے۔ وہاں جا کر بھی وہ غنڈہ گردی سے نہیں چوکے گا۔

شمی حقارت سے بولی۔

اس کے جانے کا مقصد ہی یہ ہے۔

جاوید نے مسکرا کر کہا۔

تم دونوں غلط کہتی ہو۔ وہ بیرسٹری پاس کرنے جا رہا ہے تاکہ اپنے نامور باپ کے جرائم کی پیروی کرتا رہے۔

شمی نے کہا۔

لعنت بھیجئے ابا۔ آپ بھی صبح ہی صبح کس کی منحوس تصویر دیکھنے بیٹھ گئے۔

جاوید نے کہا۔

فرید کی دیکھا دیکھی اسے بھی باہر کی تعلیم کا شوق چرایا ہے۔

شمی نے دریافت کیا۔

فرید بھائی کتنے عرصے کے لئے باہر گئے ہیں ابا؟

جاوید نے جواب دیا۔

چار پانچ سال تو ویسے ہی سمجھو۔ پھر ایک دو سال اس کا ارادہ ہے کہ وہیں گزارے۔

شمی بولی۔

کیوں؟ کیا کریں گے اتنے دن رک کر۔

حنیفہ کو کچھ تعجب سا ہو رہا تھا کہ آج شمی کیسے فرید کے متعلق گفتگو کر رہی ہے۔ حنیفہ اس چیز سے آگاہ تھی کہ اس کی لڑکی فرید کے باب میں کافی سرد تھی۔ اسی وجہ سے اپنے شوہر کے بارہا ایما کے باوجود وہ شمی سے فرید کی بات ٹھہرانے میں اکثر پہلو تہی کر جاتی تھی۔

لیکن جاوید یہی چاہتا تھا کہ اس کے ہونہار اور محب وطن بھانجے کی شادی حسین شمی سے ہو۔ اسی وجہ سے اکثر اس مسئلہ پر حنیفہ

کو ہموار کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ صفیہ کبھی تو اس کا دل رکھنے کو اقرار کر لیتی، کبھی گول ہو جاتی۔

اس کے یہ معنی نہ تھے کہ صفیہ کو فرید پسند نہ تھا۔ وہ ہر طرح سے خوش تھی مگر اس کی سگی بہن کا لڑکا اسد موجود تھا جس کے ہوتے ہوئے وہ اپنی بیٹی کسی دوسرے کو کیوں دیتی۔ پھر ویسے بھی لکھا پڑھا نوجوان تھا اور اس تعطیلات میں اپنی خالہ کے پاس گئی تھی تو اسد اس پر رنگ جمائے بغیر نہ رہا تھا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ شمی نے آج تک فرید کے باب میں اندرونی طور پر اپنے دل کو پڑھا نہ تھا۔ بس ضد اور اکڑ پر جمی رہی تھی اور فرید کے متعلق اپنی بدگمانی کو یقین کا رنگ دے چکی تھی۔

مگر دفعتاً واقعات کی شاخیں پھیلیں اور جس قابل نفرت شخص کا شریک کار اور دوست وہ فرید کو سمجھ بیٹھی تھی، وہی شخص اس کے در پئے قتل ثابت ہوا۔ اگرچہ وہ اسے قتل نہ کر سکا تھا، پھر بھی اقدام قتل کے سلسلہ میں اسے شدید زخمی کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

اس انکشاف کے بعد ایک طرف تو عبید فرید کی دوستی کے باب میں شمی کے مغالطہ کا ازالہ ہوا اور دوسری طرف اسے فرید

کی ناکردہ گناہی و مظلومیت پر رحم آیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی قومی خدمات کے متعلق بھی اس کے خلوص و صدقِ نیت کی معترف ہو گئی۔

پھر اب تک جس طرح اس نے فرید کے ساتھ اپنا طرزِ عمل روا رکھا تھا۔ بُری رائے کی شکار ہو رہی تھی اور ہر طرح سے اسے زک پہنچانے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ ان تمام باتوں پر اسے سخت پچھتاوے اور ندامت نے علیحدہ گھیر لیا تھا۔

فرید و شمی کی نسبت کے معاملہ میں اپنی بیوی کو خاموش دیکھ کر اب جاوید نے بھی اس موضوع پر صفیہ سے گفتگو کرنا چھوڑ دیا تھا۔ پھر ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ صفیہ نے ایک جیتا جاگتا چاند سا بیٹا جاوید کو دیا تھا جس کی خوشی میں جاوید سب کچھ بھول گیا تھا۔

اس بچے کی خوشی ماں باپ کو تو خیر ہونی ہی چاہئے مگر شمی کی مسرت کی انتہا نہ رہی تھی۔ اسے کھیلنے کو ایک ننھا سا خوبصورت بھائی مل گیا تھا جسے تمام دن چھاتی سے لگائے رہتی تھی۔

اس طرح فرید کو وطن سے گئے ہوئے چھ ماہ گزر گئے اور اب اس کے باب میں شمی پر بھی وہ ندامت طاری نہیں رہتی تھی۔

آخر چار ماہ بعد حسب وعدہ شمی کے ہاں تعطیلات گزارنے اسد آ کودا۔ اس کے ساتھ اس کی والدہ بھی تھی۔ صفیہ اپنی بڑی بہن سے مل کر بہت خوش ہوئی اور اسد کو دیکھ کر بھی اس کی آنکھوں میں نور آ گیا۔

اسد کی ماں نے صفیہ سے کہا۔

کہاں ہیں تمہارے میاں! کیا ہمیں دیکھ کر پردے میں جا بیٹھے۔

صفیہ نے کہا۔

وہ تو اب کل شام کو آئیں گے۔ بڑا کام کرتے ہیں۔
اسد نے کہا۔
ہیں کیسے؟ ان کا فوٹو تو ہو گا۔
صفیہ مسکرا کر بولی۔
وہ اپنا فوٹو آپ ہی ہیں۔
شمی نے کہا اور جلدی سے سوتے ہوئے بچے کو اٹھا لائی۔
واہ! یہ رہا ان کا فوٹو۔
صفیہ کی بہن نے بچے کو کلیجے سے لگا کر کہا۔
آہا! یہ تو بڑا پیارا چاند ہے۔
صفیہ نے کہا۔
اسد! تمہارے آنے سے مجھے بڑی خوشی ہوئی۔
اسد نے کہا۔
کیوں نہ آتا خالہ جان! شمی جو اس قدر اصرار کر آئی تھیں۔
شمی نے کہا۔
جھوٹ نہ بولیئے اسد بھائی! آپ ہی ہمارے ہاں آنے کو

ٹہل رہے تھے۔ میں نے کوئی اصرار نہیں کیا تھا۔
اسد بولا۔
اس کا یہ مطلب کہ میں بغیر بلائے چلا آیا۔
صفیہ نے مسکرا کر کہا۔
نہیں میاں! تمہارا آنا ہمارے سر آنکھوں پر۔ تم تو ہمارے بزرگ ہو۔
اسد کی ماں بھی ہنسی۔
اسد نے کئی بار چاہا کہ وہ اور شمی اٹھ کر باہر ٹہلیں۔ اِدھر اُدھر کی سیر کریں۔ مگر شمی نے اس کی یہ آرزو پوری نہیں کی۔ اسد کو کیا معلوم تھا کہ اب یہ وہ شمی نہیں رہی ہے جو پانچ چھ مہینے پہلے اس کے ہاں آئی تھی۔ اس وقت تک شمی پر انکشاف نہیں ہوا تھا کہ فرید کے بارے میں اس کی غلط فہمی احمقانہ تھی اور فرید تو بہت بڑے کردار کا نوجوان نکلا۔
بہر حال اسد کے اصرار بلیغ پر شمی مکان کے کمرے دکھانے لے گئی۔
صفیہ کی ہمشیرہ نے اس سے دریافت کیا۔
کیسا ملا یہ میاں تمہیں؟

صفیہ نے جواب دیا۔
اللہ کا شکر ہے لاکھوں میں ایک۔
اس کی بہن نے کہا۔
خوش قسمت ہو تم۔ تمہارا پہلا شوہر بھی بُرا نہ تھا۔
صفیہ چپ ہو گئی۔
اس کی بہن نے مرحوم مشرف کے متعلق دریافت کیا۔
آخر کس طرح جان چلی گئی اس بیچارے کی؟
صفیہ نے کہا۔
اب اس ذکر سے کیا فائدہ آپا!
اس کی بہن نے کہا۔
میرا مطلب تو یہ تھا کہ تمہارا یہ شوہر تو آخر پولیس کا آدمی ہے۔
اس نے کچھ سراغ نہیں لگایا قاتل کا؟
صفیہ نے کہا۔
کیا آپ کو نہیں معلوم کہ ملک میں ایسا ایسا نمک حرام بیٹھا ہے جس کے آگے نہ پولیس کی چل سکتی ہے اور نہ کسی کی۔ جاوید اگر بدمعاشوں کی سراغ رسانی بھی کرتے ہیں تو اوپر والے ان کی کوششیں ختم کر دیتے ہیں کیونکہ حکومت میں جتنے بدمعاش اندر ہیں ان

سے زیادہ ہر کام کر رہے ہیں۔

اچھا کیا تمہارے جاوید کا ایک بھانجہ یا بھتیجہ بھی تو ہے؟

صفیہ نے پوچھا۔

ہاں! ہے تو سہی، آپ کو کس طرح معلوم؟

اس کی بہن نے جواب دیا۔

شمی ہی سے معلوم ہوا تھا۔

صفیہ کو تعجب ہوا کہ شمی نے فرید کا ذکر وہاں بھی کیا تھا۔

آخر کیوں؟

صفیہ نے کہا۔

بھانجہ ہے۔ وہ کئی ماہ ہوئے باہر تعلیم کے لئے گیا ہے۔

کیا عمر ہو گی اس کی؟

صفیہ نے جواب دیا۔

ماشاءاللہ جوان ہے

صفیہ کی بہن نے کہا۔

یہ سوالات مجھے کیوں کرنے پڑ رہے ہیں کہ آخر وہ تمہارے میاں کا بھانجہ ہے۔ تو کہیں ان کی خاطر تم اپنے خود کے بھانجے کو

نہ بھول جاؤ۔

صفیہ نے کہا۔

مرضی تو جاوید صاحب کی بھی یہی تھی مگر اب چپ ہے۔

اس کی بہن نے سوال کیا۔

اچھا! تم میرے اسد کے لئے راضی ہو نہ؟

صفیہ نے اپنے شوہر کی حمایت میں کہا۔

ہاں! میری تو یہی مرضی ہے مگر میں اپنے شوہر سے استصواب کئے بغیر کچھ نہیں کر سکوں گی۔

صفیہ کی بہن نے کہا۔

مگر تمہاری ثمی جاوید کے لئے بالکل غیر ہے چنانچہ ثمی کے بیاہ شادی کے معاملہ میں فیصلہ کرنے کا حق تنہا تم ہی کو ہے، جاوید کو نہیں۔

صفیہ نے کہا۔

نہیں آپا! تم چونکہ جاوید سے ملی نہیں ہو اس لئے تمہارا یہ خیال ہے، ورنہ جاوید میرے اور ثمی کے مالک ہیں بہر حال اس سے مطمئن رہو کہ اگر میں نے اسد کے متعلق جاوید سے اصرار کیا تو وہ فرید کو درمیان میں لانے کی کوشش نہیں کریں گے۔

اس کی بہن نے دریافت کیا
تمہیں اسد پسند تو ہے نہ؟
صفیہ نے مسکرا کر کہا۔
یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ اسد آخر میرا بھی خون ہے

اسد جب سے آیا تھا، برابر شمی کے تعاقب میں لگا رہا۔ کیوں کہ وہ اس کے ہاں جب گئی تھی تو اپنی توجہ کے چند ریزے اس کے سامنے ڈال آئی تھی۔ اسد اب تک انہی پر پل رہا تھا اس سے وہ بالکل بے خبر تھا کہ وہاں سے آنے کے بعد شمی پر فریدہ کی صحیح پوزیشن کے متعلق الہام ہو چکا تھا اور اب وہ اسے یاد کر کے صرف اس کی خوش نصیبی میں اضافہ کرنے میں لگی ہوئی ہے۔

دوسرے روز شام کو جاوید بھی اپنے دورے پر سے آ گیا۔ بیتاب تھا کہ گھر میں آتے ہی بیوی اور بچے کو پیار کرے گا، مگر یہاں اس نے ایک عورت اور ایک جوان لڑکے کو بیٹھا ہوا پایا تو تعجب ہوا۔

صفیہ نے ہنس کر اپنی بہن سے کہا۔
آپ سے ملئے۔ آپ ہیں مولٰنا جاوید۔

اسد کا خیال تھا کہ ابھی وہ چونکہ آیا ہی آیا ہے۔ اس لئے شمی اس سے تکلف برت رہی ہے۔ حالانکہ وہ شمی کا مہمان تھا۔ اس کے علاوہ شمی جب اپنی خالہ کے پاس گئی تھی باتوں سے بھی اس نے اسد کو مایوس نہیں کیا تھا۔

مگر اسد کو یہاں آئے ہوئے ایک ہفتہ سے زیادہ گزر گیا تھا۔ شمی تھی کہ اس کی طرف کوئی التفات نہیں کر رہی تھی جیسے اس نے کبھی اسد کی حوصلہ افزائی کی ہی نہیں تھی۔

لیکن اسد مایوس کیوں ہوتا۔ شمی پر وہ اپنا حق سمجھتا تھا۔ اسی

طرح اس کی والدہ بھی اپنی بھانجی یعنی شمی کو اسد ہی کے لئے سمجھتی تھی۔ ادھر خود صفیہ اپنوں کو چھوڑ کر غیروں سے گھر اپنی لڑکی دینے کی روادار نہ تھی اور پھر آخری انسان یعنی جاوید بھی ظاہر ہے کہ اکثریت ہی کی طرف داری کرنے پر مجبور ہو سکتا تھا۔

مگر شمی کے معاملہ میں جاوید بھی آخری آدمی نہ تھا بلکہ خود شمی ہی تھی کیونکہ یہ اس کا اپنا مسئلہ تھا۔ شمی کی کیفیت یہ تھی کہ جس طرح رُکے ہوئے پانی کا بند ٹوٹ جاتا ہے تو وہ سیلاب لے آتا ہے۔ اسی طرح فرید کے معاملہ میں شمی کے جذبات میں ایک دم طغیانی آگئی تھی کیونکہ اس کے جذبات کو غلط فہمی نے دو سال سے روک رکھا تھا۔

ایک شام کو سب باہر لان میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ جاوید ابھی ابھی باہر سے آیا تھا۔ اس نے کپڑے بھی نہیں اتارے، اسی گروپ میں آبیٹھا۔ اس کی عادت تھی کہ ہفتے میں ایک دو بار شمی کے لئے ضرور ایک نہ ایک چیز خرید لاتا تھا اسی وجہ سے اس کے آتے ہی پہلا کام شمی یہی کرتی تھی کہ اس کا چمڑے کا بیگ ٹٹولنے لگتی تھی۔

اسے حسبِ معمول بیگ ٹٹولتا دیکھ کر جاوید مسکرا کر بولا۔

لغنسوس شمی! آج کچھ نہ لاسکا۔
اسد نے شمی کو چھیڑنے کے لئے کہا۔
خالوجان! آپ اپنے بیگ کو شمی کے حوالے کیوں کر دیا کرتے ہیں۔ اس میں راز کے سرکاری کاغذات ہوتے ہوں گے۔
جاوید نے مسکرا کر کہا۔
ہاں اسد میاں مگر مجھے اپنی بیوی اور بیٹی پر کامل بھروسہ ہے۔
شمی نے ایک لفافہ نکال کر کہا جس میں کوئی فوٹو تھا۔
ارے! یہ کس کا فوٹو ہے ابا آپ کے بیگ میں؟
جاوید نے جواب دیا۔
اوہو! میں بھول گیا تھا۔ فرید نے اپنا تازہ فوٹو روانہ کیا ہے۔
شمی نے کہا اور فرید کا فوٹو نکال کر اسے ہر ہر زاویے سے دیکھنے لگی۔
خاصے تو نظر آرہے ہیں۔
صفیہ نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

دکھانا شمی ذرا۔

شمی نے اسے تھوڑی دیر اور دیکھ کر اپنی ماں کے حوالے کر دیا۔

صفیہ کی بہن اور اسد کو فرید یا اس کے فوٹو سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ انہوں نے کسی بے تابی کا اظہار نہیں کیا آخر میں اسد نے شاید اس خیال سے اس فوٹو کو دیکھا کہ فرید ہے کیسا۔

وہ شاید اس تصویر کو درخور اعتنا نہ سمجھتا مگر شمی کو اس میں اس قدر دلچسپی لیتے دیکھ کر اسے جلن سی ہوئی تھی۔ بہر حال فوٹو کو دیکھ کر سامنے کی میز پر ڈال دیا۔

شمی نے کہا اور فوٹو اٹھا لیا۔

آپ تو کہہ رہے تھے ابا کہ آج میرے لئے کچھ نہ لا سکے۔

فرید بھائی کا فوٹو تو لائے ہیں آپ۔

جاوید نے مسکرا کر کہا۔

اسے میں نہیں لایا ہوں بلکہ یہ خود آگیا ہے کیونکہ اسے فرید نے روانہ کیا ہے۔

شمی نے دریافت کیا۔

میرے لئے یا آپ کے لئے؟

جاوید بولا۔
سب کے لئے۔
فرید کا فکر طوالت پکڑ گیا تھا۔ اس لئے اسد اور اس کی والدہ بیزاری سی ظاہر کرنے لگی
آخر صفیہ کی بہن نے کہا۔
جاوید میاں! کیا آپ شمی کو اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر نہیں بھیجیں گے؟
جاوید نے اپنی بیوی سے تائید چاہتے ہوئے دریافت کیا۔
میں تو شمی سے بارہا کہہ چکا ہوں۔ کیوں صفیہ؟
صفیہ نے کہا۔
اسے صرف اپنے گھر کا کونا ہی پسند ہے۔ یہ کہیں جانا نہیں چاہتی۔
اسد نے کہا۔
کاش! ابا جان مجھے بھی کہیں بھیج دیں مگر انہیں خیال ہی نہیں آتا۔
شمی بولی۔

کیا فائدہ۔ اپنے وطن میں اعلیٰ تعلیم کے بلند مرکز کیوں نہ قائم کئے جائیں۔ بات بات پر باہر کے ملکوں کی طرف دوڑنا احساس کمتری کی دلیل ہے۔

صفیہ و جاوید ہنسنے لگے۔

اسعد نے کہا۔

میں ایم۔ اے کے بعد کیا کروں خالو جان؟ کچھ مشورہ دیجئے نہ۔

جاوید نے کہا۔

اسعد میاں! اس بد قسمت ملک میں تعلیم کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ بہر حال اچھا یہ ہے کہ وکالت کر لو۔ ممکن ہے آگے جا کر تم بھی وزیر بن جاؤ۔ کیونکہ یہاں وزارت سب سے سستی چیز ہے۔ کسی سے پوچھیے کہ کیا کام کرتے ہو تو بہت کم لوگ جواب دیں گے کہ وکالت کرتا ہوں یا طبابت کرتا ہوں یا تجارت کرتا ہوں مگر بہت سے لوگ یہ جواب دیں گے کہ وزارت کرتے ہیں۔ گویا یہ بھی کوئی پیشہ ہے۔

اسعد نے کہا۔

جی ہاں! یہاں وزارت کے لئے تعلیم، کردار یا پچھلی قومی

غدامات کوئی معنی نہیں رکھتیں بلکہ چالاکی، بے ایمانی اور غداری اس کے لئے سب سے بڑی کوالیفیکیشن ہیں۔

صفیہ نے مسکرا کر کہا۔

تم تو اس طرح کہہ رہے ہو۔ جیسے یہ تمام صفات تمہارے خالو میں موجود ہیں۔

جاوید مسکرا کر بولا۔

مگر خالو بے چارہ وزیر کب ہے۔ ایک معمولی سا سپاہی ہے۔

شمی نے کہا۔

کیا ابا جان یہ ممکن نہیں کہ ہمارے بگڑے ہوئے ملک کا نظام فوج اپنے ہاتھ میں لے لے۔ امید ہے کہ اس سے یہ تمام ابتری مٹ جائے گی۔

جاوید مسکرانے لگا۔

صفیہ نے اسے تنبیہ کی۔

چپ رہو شمی! دیوار ہم گوش دارد۔

جاوید مسکرا کر بولا۔

ناحق ڈرا نے بیٹھ گئیں شمیم کو۔

منی نے کہا۔

ہم سب ایک گروپ کا فوٹو کھنچوا کر فرید بھائی کے پاس کیوں نہ بھیجیں۔ انھوں نے خالہ اور اسعد بھائی کو نہیں دیکھا ہے اور ہاں منے کی تصویر کو دیکھ کر تو وہ اُچھل پڑیں گے۔

جاوید نے کہا۔

تمہارا خیال ہے تو اچھا۔

صفیہ نے کہا۔

ہاں واقعی کم از کم منے کی تصویر تو فرید کے پاس بھیجنی چاہیئے۔

اسعد نے کہا۔

منی کی تصویر علیحدہ جائے۔

اس میں طنز تھی۔

منی نے صرف انتقاماً کہا۔

اور آپ کی الگ۔

مگر اسعد نے اس کا یہ مطلب لیا۔ گویا یہ جوڑا ہوگا۔

صفیہ کی بہن لیلی۔

اور اگر فرید نے ان سب کے جواب میں اپنی کسی میم کی تصویر

بھیج دی۔

سب سے پہلے شمی نے اس کی تردید کی۔
فرید اس قسم کے آدمی نہیں ہیں۔
صفیہ نے بھی اس کی تائید کی۔ پھر بولی۔
ہاں فرید دوسرے لڑکوں سے مختلف ہے۔
اس کی بہن مسکرانے لگی۔
البتہ اگر آپ جاوید کے متعلق یہ کہتیں تو شاید یقین آ جاتا۔
جاوید نے مسکرا کر کہا اور کپڑے بدلنے چلا گیا۔
اب یہ بھی کرنا پڑے گا۔

فریدہ کے ذکر، اس کی تعریف اور اس کے فوٹو وغیرہ میں شمی کو اس قدر دلچسپی لیتے دیکھ کر اسد کا ڈر ہو گیا۔ اس کا تو خیال تھا کہ اس دفعہ کے بلے میں وہ شمی کو مکمل طور پر جیت کے جائے گا۔ مگر اسے کچھ ایسا معلوم ہوا۔ گویا اس کے ہاتھ سے نکلا جا رہی ہے۔

دو تین روز بعد شمی نے فریدہ کا فوٹو فریم کرا لیا۔ اگرچہ یہ فوٹو اس نے اپنے کمرے میں لے جا کر نہیں رکھا تھا مگر ڈرائینگ روم میں رکھ دیا تھا تاکہ شمی کی اس میں دلچسپی کا راز بھی چھپا رہے۔

اور وہ کھانے اور ناشتہ وغیرہ پر اس پر نظر بھی ڈال لیتے۔
اسد ایک روز بھی شمسی کو سینما تو کجا باہر بھی کہیں سیر و تفریح کے لئے لے جانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ہاں جب گھر کے دوسرے افراد بھی مل کر باہر جاتے تو وہ بھی ہمراہ ہو جاتی تھی۔ مثلاً پکنک وغیرہ میں۔
ایک روز جاوید نے سب کو خوش خبری سنائی۔
کل میں نے بڑی کار کا انتظام کیا ہے اس میں سب فرد دور پکنگ کو چلیں گے۔
صفیہ کی بہن نے جاوید سے کہا۔
تمہارے حکم سے تو پولیس کی بڑی گاڑیاں تک آسکتی ہیں۔
جاوید نے کہا۔
نہیں آپا! میں اپنے پرائیوٹ کاموں میں پولیس کی گاڑی استعمال نہیں کرتا۔
صفیہ نے مسکرا کر کہا۔
ان کا تو بس نہیں چلتا ورنہ شاید یہ پولیس کی وردی بھی استعمال نہ کریں بلکہ اپنے پلیسہ کی سلوائیں۔
اسد نے کہا۔

میں خالو کی اسپرٹ کو پسند کرتا ہوں۔
جاوید نے کہا۔
مجھے خوشی ہوئی اسد میاں کہ تم بھی ان چیزوں کی تائید کرتے
ہو۔ میرے بھانجے فرید سے تم نہیں مل سکے۔ اس کی تو زندگی ہی
یہی ہے کہ دیانت و خلوص سے ملک کی خدمت کرتا رہے۔
اسد نے کہا۔
جی ہاں! میں نے فرید کی تعریف سنی ہے ممی سے۔
صفیہ نے کہا۔
اچھا دیکھئے کل کے پکنک میں منے کو آپ سنبھالیں گے۔
میں نہیں لاؤں گی۔
جاوید بولا۔
تمہارے حکم کی تعمیل سے قاصر رہوں گا کیونکہ میں سرکاری کاموں
میں پھنسا ہوا ہوں۔ تم لوگوں کے ساتھ نہیں چل سکوں گا۔
صفیہ نے کہا۔
بس تو اپنا پروگرام بھی ملتوی۔
صفیہ کی بہن بھی بولی۔
جاوید میاں آپ بھی چلتے تو اچھا تھا۔

شمی نے بھی کہا۔
پکنک کا لطف ہی ختم ہو جائے گا۔
اسد نے بھی شمی کی خاطر نہ جانے کا عذر کرتے ہوئے کہا
بندہ بھی نہیں جائے گا۔
جاوید نے کہا۔
یہ ایک ہی رہی۔ یہ بغاوت تم نے پھیلائی ہے صفیہ
صفیہ نے کہا۔
کوئی بات ہے کہ مہمان تو پکنک میں جائیں اور صاحب خانہ غائب۔
جاوید خوب ہنسا۔
جاوید نے کہا۔
گویا تم بھی میری مہمان ہو اور صاحب خانہ فقط میں ہوں تم کچھ نہیں ہو۔
اسد بولا۔
خالہ جان اہل خانہ ہیں۔
جاوید نے مسکرا کر کہا۔
یوں کہو کہ ایں خانہ ہمہ آفتاب است۔

صفیہ نے کہا۔

بات نہ ٹالیئے۔ کل آپ کو چلنا پڑے گا۔ ایسا ہی ہے تو ایک دن کی رخصت لے لیجیے۔

اسد نے کہا۔

آپ نے تو کہا تھا خالو کہ خالہ جان آپ کے کاموں میں مخل نہیں ہوتیں۔

جاوید نے مسکرا کر کہا۔

نہیں میں نے یہ کہا تھا کہ میری بیوی اور بیٹی قابلِ اعتماد ہیں۔ بہر حال بیوی باغی ہو سکتی ہے مگر بیٹی نہیں۔

غرض دوسرے روز سب کے اصرار پر جاوید کو ایک دن کی رخصت لینی پڑی۔ اس پکنک کی زیادہ خوشی اسد کو ہوئی۔ اسے توقع تھی کہ شمی کی وجہ سے بڑا لطف رہے گا۔

لطف تو واقعی رہا اور سب سے مزے کی ایک بات یہ ہوئی کہ شمی اپنے طور پر ساحل کی سیر کرتی ہوئی ایک نشیب کی طرف چلی گئی اور اس نشیب میں اس نے کسی مغربی ملک کے ایک جوڑے کو بوس و کنار کرتے ہوئے دیکھا۔ یورپین لڑکی نے حالانکہ شمی کو دیکھ لیا تھا مگر پرواہ نہیں کی بدستور مصروف

اختلاط رہی۔

شمی اسٹے پر واپس ہوئی۔ اس منظر کو دیکھ کر اسے تعجب ملا ہوا تھا جس حد تک جنس کا تعلق تھا وہ مرد و عورت کے باہمی اختلاط کے جذبے سے واقف تھی مگر جنس کو ارزاں یا برملا کرنے کی روادار نہ تھی لیکن مغرب اور مشرق کی تہذیب میں بہت فرق ہے۔ اب اس کا کیا علاج کہ پھر بھی مشرق مغرب میں ڈھلا جا رہا ہے۔

شمی ابھی چند قدم ہی گئی ہوگی کہ اس نے اپنے عقب میں ذرا تیز تیز سانسوں کی آواز سنی۔ مڑ کر جو دیکھا تو وہ جوڑا بھاگتا ہوا اس کے پیچھے آ رہا تھا۔

مغربی لڑکی لباس غسل میں تھی جس سے اس کے سفید اور سڈول جسم کے نقش و نگار بہت خوبصورتی سے نمایاں تھے۔ وہ ہنستی ہوئی شمی کے آگے آ کھڑی ہوئی۔ اس کے بعد مرد بھی قریب آیا اور مسکرا کر شمی سے مخاطب ہوا۔

معاف کیجئے۔ کیا میں آپ کو بھی چوم سکتا ہوں۔ آپ بھی بڑی خوبصورت ہیں۔

اس کے الفاظ سے شمی گھبرائی۔ کیا جواب دیتی مگر یہ غنڈہ

عبید نہ تھا جو زبردستی اس کے انتوا کے در پہ ہوا تھا۔ مغرب کے اس انسان نے اتنی تہذیب کا ثبوت تو دیا تھا کہ شمی سے اپنے اقدام کی اجازت طلب کی تھی۔ اگرچہ اس کا سوال بھی بشیری پر دال تھا۔ یا ممکن ہے اس نے محض مذاق میں یہ الفاظ کہے ہوں۔

آخر شمی نے جواب دیا۔

مگر آپ کو اپنی ایسی حماقت کی بڑی قیمت ادا کرنی پڑے گی جس کا آپ کی محبوبہ کو بھی رنج ہوگا۔

لڑکی نے مسکرا کر شمی سے کہا۔

ہم تو سمجھے تھے کہ تمہارے ملک کی لڑکیاں بھی مزے اڑاتی ہوں گی۔

شمی نے اس سے کہا اور چلی آئی۔

آپ لوگ تہذیب کو پامال کر کے بہت آگے بڑھ چکے ہیں یعنی بہائم کی حد میں جا پہنچے ہیں مگر میرے ملک کی لڑکیاں انسانیت و تہذیب کے دائرے میں خوش ہیں۔

شمی سوچ رہی تھی کہ ان لوگوں کی زندگی اتنی آزاد ہے کہ جب چاہیں یہ بہائم کی طرح حرکات کرنے لگتے ہیں۔ گائے،

بیل، بکری، بکرا بھی تو یہی کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کے لئے دنیا کا کوئی قانون کچھ معنی نہیں رکھتا۔ شرم و حیا کے جذبات ان میں نہیں ہوتے۔

اس کے بعد شمی ان کے اختلاط کا تصور کرنے لگی عجیب جذبہ ہے یہ بھی اور اس کے اظہار کے ذرائع بھی کتنے عجیب ہیں جن سے انسان خود بھی عجیب نظر آنے لگتا ہے۔

اسد نے اسے دیکھ کر کہا۔

کہاں غائب ہو گئیں تھیں شمی۔ میں تمہیں ہر طرف تلاش کر آیا۔

شمی نے مسکرا کر کہا۔

ذرا سمندر کے پیندے تک گئی تھی۔ وہاں کیسی کیسی عجیب مخلوقات ہیں اسد!

جاوید بولا۔

اچھا اب واپس کے متعلق کیا خیال ہے؟

صفیہ کی ہمشیرہ نے کہا۔

ہمیں اب چلنا چاہیئے۔ کافی وقت ہو گیا۔

چنانچہ تھوڑی دیر بعد سب واپس روانہ ہوئے۔

This story is very very good

صفیہ کی بہن کو یہاں آئے ہوئے پندرہ روز سے زیادہ ہو گئے تھے مگر اب تک وہ شمی اور اپنے لڑکے اسد کے بارے میں صفیہ و جاوید سے کھل کر بات نہیں کر سکی تھی۔

اسے یہ تو امید تھی صفیہ آمادہ ہے اور چونکہ صفیہ کا اپنے شوہر پر کافی اثر ہے۔ اس لئے توقع تھی کہ اس رشتہ کی جاوید بھی مخالفت نہیں کرے گا مگر ان قیاس آرائیوں سے کیا فائدہ اب وہ یہاں آئی تھی تو رشتہ پختہ ہی کر کے کیوں نہ جائے۔ شمی ایسی لڑکی تھی کہ اگر اس کے بارے میں غفلت کی گئی تو ہاتھ سے

نکل جائے گی۔

یہ سوچ کر آخر ایک دو روز بعد صفیہ کی بہن نے جاوید اور صفیہ کے سامنے شمی و اسد کا ذکر چھیڑ ہی دیا۔ شمی دوسرے کمرے میں تھی اور اسد کہیں باہر گیا ہوا تھا۔

اس کی بہن نے کہا۔

صفیہ کیا مجھ سے صاف ہی کہلواؤ گی کہ میں شمی اور اسد کی بات لگا کر ہی ٹلوں گی۔

صفیہ نے کہا۔

آپ مجھ ہی سے کیوں آپا۔

جاوید نے بھی اپنی بڑی سالی سے مذاق میں کہا۔

اُلٹی تو ناف سے ہے۔

صفیہ کی بہن نے کہا۔

ہنسی میں نہ اڑاؤ۔ تم دونوں میاں بیوی موجود ہو۔ میری بات کا جواب دو۔

صفیہ نے مسکرا کر جاوید کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

یہ بزرگ کھڑے ہوئے ہیں۔ آپ ان کے پیچھے کیوں نہیں پڑتیں آپا۔

اس کی بہن بولی۔

پہلے میں تم سے سوال کرتی ہوں۔

صفیہ کو اس رشتہ میں کوئی امر مانع نظر نہیں آتا تھا مگر پھر بھی یہ اس کی اکلوتی اور ہونہار لڑکی کا معاملہ تھا۔ اس لئے ذرا رکی۔

جاوید اپنی بیوی کے خیالات کو پا گیا۔ چنانچہ اس کی رستگاری کو آتا ہوا بولا۔

بیاہ شادی کے مسائل بڑے مبارک ہوتے ہیں مگر کیا آپ ہمیں سوچنے کا موقع نہیں دیں گی آپا۔

صفیہ کی بہن نے کہا۔

میاں بعض دفعہ انسان عمر بھر سوچتا ہے۔ پھر بھی کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتا۔ پھر سوچنے اور غور کرنے کی کونسی بات ہے۔ شمی اور اسد آپس میں کوئی غیر نہیں ہیں۔ دونوں کا ایک ہی خون ہے۔

اب معاملہ خون کا آپڑا تھا۔ اس لئے جاوید کو ذرا علیحدہ ہو جانا پڑا۔

آخر صفیہ بولی۔

یہ ٹھیک ہے آپا۔ اسد آخر میرا ہی تو لگا بھتیجا ہے۔

صفیہ کی بہن نے کہا۔

مجھے بڑی خوشی ہوئی صفیہ. بات یہ ہے کہ تمہارے بہنوئی کو اپنے بیٹے کی کوئی فکر نہیں۔ اس لئے تمام معاملات مجھے ہی اپنے سر لینے پڑتے ہیں۔ اس کے علاوہ شمی جیسی بچی اسد کے لئے بہت ہی موزوں ہے۔

صفیہ نے جواب دیا۔

اس سے مجھے بھی اختلاف نہیں۔

صفیہ کی بہن اس دفعہ جاوید سے مخاطب ہوئی۔

اب آپ بتایئے جاوید میاں! آپ کی رائے بھی ضروری ہے۔

جاوید نے کہا۔

آپ دونوں بہنوں کی رائے سے میری رائے ظاہر ہے کہ مختلف نہیں ہونا چاہیئے مگر جہاں تک میں شمی کو سمجھ سکا ہوں میرے اندازے کے مطابق وہ بھی اپنے ذاتی مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

صفیہ کی بہن نے کہا۔

آپ کا یہ مطلب ہے کہ شمی کا عندیہ بھی لیا جائے۔ اس کی ایسی کوئی خاص ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اگر ایسا ہی تو اس کے

علم میں یہ بے آپا جانا کافی ہوگا کہ اس کی نسبت اسد کی جارہی ہے۔

صفیہ نے کہا۔

میرا خیال ہے کہ میری شمی اپنی والدہ اور خالہ کے خلاف نہیں جائے گی۔

جاوید کس توقع پر فرید کے متعلق کچھ کہتا۔ ایک تو وہ لمبی مدت کے لئے باہر گیا ہوا تھا۔ دوسرے شمی نے فرید سے آج تک کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ چنانچہ جاوید خاموش ہو گیا۔ تاہم وہ چاہتا ہی تھا کہ اگر شمی فرید کو مل جاتی تو اچھا تھا۔

جاوید نے دریافت کیا۔

اچھا! تم دونوں بہنوں میں سے اس مسئلہ کو شمی کے علم میں کون لائے گا؟

صفیہ نے جواب دیا۔

آپا تو کیسے لا سکتی ہیں۔ مجھ ہی کو اس سے کہنا پڑے گا۔

جاوید بولا۔

اپنے ہاں بیاہ شادی کے مسائل بھی معمہ سے کچھ کم نہیں ہوتے۔

صفیہ نے مسکرا کر کہا۔

بعض مرد بھی منگنے سے کم نہیں ہوتے۔ کسی کے ہاں اپنی شادی کا پیغام بھیج کر گول بھی ہو جاتے ہیں۔

اس کا اشارہ جاوید کی طرف تھا جس نے صفیہ سے اپنے نکاح کا پیام دے کر پھر سال بھر تک خبر نہیں لی تھی۔

جاوید ہنستے لگا۔ صفیہ کی بہن اس رمز کو نہیں سمجھی۔

شمی اپنی ماں کا کہنا مانتی تھی اور صفیہ کو پورا بھروسہ تھا کہ شمی اس رشتہ کو اپنی والدہ کے کہنے سے قبول کر لے گی مگر پھر بھی صفیہ نامعلوم کیوں اس مسئلہ کو اس کے سامنے رکھنے سے جھجک سی رہی تھی۔

آخر ایک دو روز بعد صفیہ نے تنہائی میں شمی سے دریافت کیا۔

بیٹی شمی! کیا تم اپنی ماں سے اپنی آئندہ کی زندگی کے متعلق صاف گفتگو کرنے میں شرم محسوس کرو گی؟

شمی بولی۔

آئندہ زندگی؟ میری زندگی کو کہاں سے آئندہ کے سپرد کر رہی ہیں آپ؟

صفیہ نے مسکرا کر کہا۔

تمہیں پھر بتاؤں گی۔ پہلے میرے سوال کا جواب دو۔

شمیم نے کہا۔

اس کا کیا جواب ملے امی آپ کو۔

اور اس پر اپنی ماں کے سامنے بھی خفیف سی حیا طاری ہو گئی۔

وہ سمجھ تو گئی تھی کہ اس کی شادی کا معاملہ معلوم ہوتا ہے مگر کہاں؟

یہ جاننے کے اسے تشویش سی ہونے لگی

کیا میرا سوال تمہاری سمجھ میں نہیں آیا؟

شمی نے اپنی والدہ کو ٹالنے کی نیت سے کہا۔

پھر کبھی سمجھنے کی کوشش کروں گی امی! اس وقت تو مجھے پڑھنے دیجئے۔

صفیہ ہنسی۔

صفیہ نے کہا اور کتنا تنتا اسے بتایا کہ اس کا معاملہ اسعد کے متعلق ہے۔

مگر وہ چار روز بعد تمہاری خالہ چلی جائیں گی۔

شریر شمی نے اس دفعہ بھی صاف اڑنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

دیکھئے نہیں پڑھ رہی ہوں۔ خالہ جان کا چلا جانا میرے پڑھنے

سے زیادہ اہم نہیں۔

ماں نے ہنس کر کہا۔

دیوانی کہیں کی۔ مجھے بتانے لگی لیکن میں تیرا جواب لے کر رہوں گی۔

شمی نے مسکرا کر کہا۔

تو یہ ہے۔ اچھا! آپ اصرار ہی کرتی ہیں تو جو کچھ مجھے کہنا ہے، منّے کو بتا دوں گی۔ پھر وہ آپ سے کہہ دے گا۔

صفیہ خوب ہنسی۔

صفیہ نے کہا۔

ہاں تو چھ ماہ کے منّے کو کسی معجزے سے باتیں کرنا سکھا دے گی۔ ٹال نہیں میری شمی۔ دیکھ ایک تو گھر پرایا نہیں ہوگا دوسرے اسد تیرا بھی دیکھا بھالا ہے۔

آخر اسد ہی نکلا نہ۔ اپنی ماں کی زبان سے اس کا نام سن کر شمی نے دل میں کہا۔ اور اس کی شفاف پیشانی پر ہلکے سے بل پڑ گئے۔

شمی کو خاموش پا کر صفیہ نے مسکرا کر کہا۔

شکر ہے تو انکار نہیں کیا اور اس رشتہ کو میرے کہنے سے منظور کر لیا۔

شمی اس دفعہ بھی کچھ نہ بولی مگر اس کی پیشانی پر بل اب بھی تھے۔
صفیہ نے چلتے چلتے خوش ہو کر کہا۔
اِن شاء اللہ تو بہت خوش و خرم رہے گی۔ اسد بہت اچھا اور ہونہار لڑکا ہے۔ ایک تو اپنے ہی گھرانے کا دوسرے اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی۔ وہ کبھی تیرے دل پر میل نہیں آنے دے گا۔
اور جا ماکہ اپنی بہن کو بھی جا کر خوش خبری سنا دے کہ شمی کی آواز آئی۔
امی کل تک اور انتظار کر لیجئے۔
اس کے بعد شمی پڑھنے میں مصروف ہو گئی اور صفیہ بھونچکی سی رہ گئی۔

کل کیا ہو جائے گا جس کا انتظار کروں۔ شمی کے پاس سے آکر صفیہ نے دل میں کہا۔ مجھ سے شرماتی ہے دیوانی۔ یا صرف مجھے چھیڑنے کو اس نے یہ الفاظ ادا کئے ہوں گے۔ بہر حال آپا کو خوش خبری سنا ہی دینی چاہیئے کہ شکر ہے میری بچی نے انکار نہیں کیا۔

مگر صفیہ پھر رک گئی۔ وہ اپنی بچی کو خوب جانتی تھی جو اپنی ماں سے بھی زیادہ زیرک تھی۔ بلاشبہ دماغ تو اس کے عرشِ معلیٰ پر تھے مگر وہ کوئی گاودی یا جھوٹے گھمنڈ والی لڑکی نہ تھی۔

توبہ ہے اس ننھی کی بچی نے مجھے گھنجلک میں مبتلا کر دیا ہے
صاف طور پر منہ سے نہیں پھوٹی۔ خدا جانے اس کے دل میں
کیا ہے۔ کل تک انتظار ہی کرنا پڑے گا۔ ورنہ کہیں ایسا نہ ہو
کہ اس کے ہاتھوں مجھے اپنی بہن سے شرمندگی اٹھانا پڑے۔
جاوید نے نمودار ہو کر مسکراتے ہوئے اپنی بیوی سے
پوچھا۔
آج کس سوچ میں مبتلا ہو منے کی اماں؟
صفیہ مسکرا کر بولی۔
کیا بتاؤں منے اور منی کے ابا۔
جاوید نے خوش ہو کر کہا۔
آہا! کیا منی بھی آیا چاہتی ہے؟
صفیہ نے مسکرا کر دریافت کیا۔
آپ تو عجیب آدمی ہیں۔ آخر آپ کو بچوں کا اس قدر شوق
کیوں ہے؟
بچے چیز ہی ایسی ہیں۔ اچھا! پھر تم کس منی کا ذکر کر رہی
تھیں؟
صفیہ نے جواب دیا۔

وہ جو کمرے میں بیٹھی ہوئی بڑی منتیں پڑھ رہی ہے۔
کون شمی؟ کیا کیا اس غریب نے؟
صفیہ مسکرا کر بولی۔
وہ غریب نہیں ہے بڑی افعی ہے۔
جاوید نے پوچھا۔
آخر کچھ بتاؤ تو سہی ہوا کیا؟
صفیہ نے کہا۔
ابھی کوئی سوال نہ کیجئے۔
جاوید نے مسکرا کر کہا۔
اس کا یہ مطلب کہ تم کل تک شمی کے کوئی فسانہ گھڑ لوگی۔
صفیہ بھی مسکرا کر بولی۔
ہاں جی! میں تو ایسی ہی ماں ہوں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آپ کس طرح نپٹتے ہیں۔
جاوید نے کہا۔
نبٹنا کس سے؟ آخر کچھ تو بتاؤ۔
صفیہ نے سرگوشی میں کہا۔

چُپ ہو جایئے۔ آپا آ رہی ہیں۔

ادھر اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی بی بی شمی نے اپنی والدہ صاحبہ کی خدمت میں ایک طویل تاثر نامہ گھسیٹ ڈالا۔ لکھتی تھیں:۔

اس کے کیا معنی ہوتے ہیں امی کہ اگر آپ کے دل آزارانہ سوالات پر میں چُپ ہو گئی تو آپ نے سمجھ لیا کہ مجھے اسد کے ساتھ رشتہ منظور ہے۔ اس بھرّے سے نہ رہیئے۔ کہے دیتی ہوں کہ رشتہ نہیں ہو گا۔

مجھے کوئی رشتہ منظور نہیں۔ کسی سے بھی قبول نہیں۔ سمجھ گئیں آپ۔ ابا صاحب کو بھی سمجھا دیجیئے گا۔ رہی خالہ جان کی خفگی یا ناراضگی تو ان سے آپ نبٹتی رہیئے کیونکہ آپ نے تنہا اپنی ذمہ داری پر یہ الجھن مول لی ہے۔

اچھا! چلیئے میں آپ کا دل نہیں توڑنا چاہتی۔ اگر اس مسئلہ پر آپ کا اتنا ہی اصرار ہے تو خیر آپ کی اور ابا کی خاطر فرید ——

چونکیئے نہیں۔ بے شک فرید پانچ چھ سال

کے لئے باہر گئے ہیں ۔ عمران کے بارے میں مجھ سے ایک اندھا پن سرزد ہوا ہے ۔ اس کی تلافی کے طور پر میں ان کا انتظار کر سکتی ہوں ۔

کیا صاف سننا چاہتی ہیں ؟ آپ سے نہ کہئے ۔ ممکن ہے انہیں ناحق صدمہ ہو ۔ فرید کے باب میں جو مجھ سے ناانصافی ہوئی ہے ۔ وہ یہ تھی کہ میں دو سال سے برابر انہیں اپنے اغوا میں عبید کا شریکِ کار سمجھنے کی بدگمانی میں مبتلا تھی ۔ شکر ہے اب یہ نامراد غلط فہمی رفع ہو گئی ۔ چنانچہ اس کی تلافی کے لئے میں تمام عمر ان کا انتظار کر سکتی ہوں ۔ سمجھ گئیں میری پیاری امّی ۔ مجھ سے خفا نہ ہوں ۔

صبح کالج جاتے وقت سمی یہ رقعہ چپکے سے صفیہ کو دیتی گئی ۔ اس کے بعد جلدی سے بھاگ گئی ۔ غریب صفیہ نے ادھر ادھر دیکھا کہ مبادہ کہیں آپا یا اسد کی نظر نہ پڑ جائے ۔ پھر رقعہ چھپا لیا ۔

اچھا تو اس لئے مجھ سے یہ حرافہ کہہ رہی تھی کہ کل تک انتظار کر لوں ۔ خدا جانے کیا لکھ مارا ہو گا اس نے صفیہ نے بے چینی سے سوچا ۔ پھر مامتا غالب آ گئی ۔ اگر اس نے اس

رشتہ کی مخالفت بھی کی تو میں بچی پر جبر نہیں کر سکتی۔

بہر حال صفائی کے بہلانے نشست میں جا کر اس نے سشمی کا رقعہ پڑھا۔ پہلے تو وہ دنگ رہ گئی۔ اس کے بعد سشمی کی پیاری باتوں پر دل میں خوب ہنسی۔ چلو اس نے آپ فیصلہ کر لیا مگر صفدر نے مجھے تو ایک مضیق میں مبتلا کر دیا۔ اب میں آپا کو کیا جواب دوں گی۔

کئی منٹ تک صفیہ یہی سوچتی رہی۔ آخر اپنے ہمدم و مشیر شوہر کا خیال آیا۔ جاوید ہی سے یہ گتھی سلجھانے کو کہوں گی۔ چنانچہ شام کو جاوید نے گھر میں قدم رکھا تو صفیہ نے اسے جا لیا۔

صفیہ نے اس سے کہا۔

جاوید! تمہیں ایک چیز دکھانا چاہتی ہوں۔ کسی ایسی جگہ چلو کہ جہاں فقط ہم تم اکیلے ہوں۔

جاوید نے دریافت کیا۔

خیریت کی بات ہے؟

صفیہ نے مسکرا کر کہا۔

پہلے کہیں چلو۔ پھر بتاؤں گی۔

جاوید نے کہا۔

سب سے بہتر جگہ اپنا مکان ہی ہے۔

مگر یہاں آپا موجود ہیں۔ خیر اسد تو سینا گیا ہوا ہے۔

جاوید نے کہا

آپا ایسی دیوانی نہیں کہ وہ ہماری تمہاری خلوت میں چلی

آئیں۔ کہہ ڈالی ہیں۔

آخر صفیہ اسے دوسرے کمرے میں لے گئی اور ہنستے ہوئے

اس کے سامنے شمی کا رقعہ ڈال دیا۔

صفیہ نے کہا۔

ملاحظہ کیجئے اسد کے معاملہ میں اپنی شمی کا جواب۔

جاوید رقعہ اٹھا کر پڑھنے لگا۔

جاوید نے رقعہ پڑھ کر ہنستے ہوئے کہا۔

کہاں ہے شمی؟ بلاؤ اسے پیار کر لوں گا۔

صفیہ نے کہا۔

وہ غائب ہے۔ حالانکہ کالج سے آجانے کا وقت ہو

گیا ہے مگر شرم کی وجہ سے آج وہ دیر سے مکان میں داخل

ہو گی۔

جاوید نے مسکرا کر کہا۔

بھئی! یہ شمی تو بڑی لاجواب لڑکی نکلی۔ اپنی ماں سے بھی زیادہ لاجواب۔

صفیہ نے کہا۔

لیکن اس لاجواب لڑکی نے مجھے آفت میں پھنسا دیا۔ اب یہ بتاؤ کہ میں آپا کے سامنے کس منہ سے جاؤں گی۔

جاوید نے کہا۔

اس میں پریشان ہونے کی کون سی بات ہے ذرا مصلحت سے کام لینا پڑے گا۔ آپا سے یہ کہہ دینا کہ آپ کا پیام ہمیں پسند ہے اور زیر غور ہے مگر چونکہ شمی آگے تک پڑھنا چاہتی ہے اور اس کے ابا بھی اسے باہر بھیجنے کو راضی ہیں۔ اس لیے تمام معاملات اس کی تکمیل تعلیم تک چھوڑے جاتے ہیں۔

صفیہ نے مسکرا کر کہا۔

آپ کہہ دینا ان سے یہ مجھ سے آپ کی طرح جھوٹ نہیں بولا جائے گا۔

جاوید نے کہا۔

نہیں سیج کی پڑیا یہ سب تم ہی کو کہنا ہے۔
اس کے بعد دونوں ہنس ہنس کر شمی کے خط پر
تبصرہ کرنے لگے

آخر ڈرتے ڈرتے غریب صفیہ نے ایک دو روز بعد آپا کو رشمی کے متعلق مصلحت آمیز جواب دے دیا۔ آپا کو پہلے تو کچھ تعجب ہُوا اور کچھ رنج۔ پھر شاید انہیں خیال آ گیا ہو گا کہ گھر کی لڑکی ہے کہاں جائے گی۔ ایک ڈیڑھ سال بعد آخر ہو گی اسد ہی کی۔

آخر آپا نے کہا۔

اچھا تو دونوں کی منگنی تو کر دی جائے۔

صفیہ نے کہا۔

منگنی اور سگائی اب جاہلانہ رسمیں سمجھی جاتی ہیں۔ اب تو جو کچھ کریگا

پانچ چھ سال بعد ہی ہو گا آپا۔
آپا حیرت و پریشانی سے بولیں۔
پانچ چھ! میں تو ایک ڈیڑھ سال کا معاملہ سمجھی تھی۔
ایک ڈیڑھ سال میں کیا پڑھائی مکمل ہو سکتی ہے سوچئے
تو سہی آپا۔
آپا نے شکایتاً کہا۔
لیکن صفیہ کیا میں پانچ چھ سال تک اسد کو تھامے ہوئے
بیٹھی رہ سکتی ہوں۔
صفیہ نے کہا۔
آپ اسد کو سمجھانے کی کوشش کرنا۔ تو خیر اس کی مرضی
ہے۔
آپا نے کہا۔
کیا تم دونوں میاں بیوی شمی کے ہاتھوں اس قدر بکے
ہوئے ہو کہ اسے سمجھا نہیں سکتے کہ پہلے مقدم خانہ آبادی
ہے۔
صفیہ نے کہا۔
نہیں آپا مقدم تعلیم ہے۔ شادی بیاہ رک سکتے ہیں لیکن

لکھنے پڑھنے کی عمر اگر گزر جاتی ہے تو پھر پڑھائی ناممکن سی ہو جاتی ہے۔

آپا نے کہا۔

واہ! کیا بات کہی ہے تم نے۔ جیسے بیاہ شادی کی تو کوئی عمر ہی نہیں، بڑھاپے تک میں ہو سکتی ہے۔

صفیہ نے کہا۔

مگر ابھی نہ تو سمشی بوڑھی ہوئی جا رہی ہے نہ اسد۔ بلکہ دیکھا جائے تو دونوں کی شادی کے قابل عمر پانچ چھ سال بعد ہی ہونی چاہیئے۔

صفو! یہ تو سوچو کہ اسد کو کتنا رنج ہو گا۔

صفیہ نے کہا۔

رنج کی کیا بات ہے آپا۔ وہ ماشاءاللہ ہونہار لڑکا ہے اس کے لئے لڑکیوں کی کیا کمی ہے۔

ہاں! اب یہی سوچتی ہوں۔ اتنی لمبی مدت تک میں اپنے لڑکے کے ارمان کیسے مار سکتی ہوں۔

صفیہ نے کہا۔

میں بھی یہی چاہتی تھی کرشمی کے ہاتھ بہت جلد پیلے کر دوں مگر

اسے پڑھنے کا اس قدر شوق ہے کہ اس کے آگے سب کچھ بھولی ہوئی ہے۔

آپا نے کہا۔

صفیہ برا نہ ماننا۔ تم نے شمی کو بہت سر چڑھا رکھا ہے۔

صفیہ نے پوچھا۔

نہیں تو آپا۔ کیا تم نے اس کی کوئی بدتمیزی دیکھی ہے؟

آپا بولی۔

بدتمیزی تو نہیں دیکھی مگر خودسری دیکھ لی۔ اگر تم یا تمہارے جاوید اس پر تنبیہہ کرتے تو کیا وہ تم لوگوں کا حکم ٹال سکتی تھی۔

صفیہ نے کہا۔

لیکن آپا اگر میں اس کے تعلیمی ذوق کے خلاف جبریہ اس کی شادی کر دوں تو کیا وہ خوش رہ سکتی ہے اور اپنے شوہر کو بھی خوش رکھ سکتی ہے

آپا خاموش ہوگئیں۔ انہیں حقیقتاً رنج تھا کہ شمی سے اسد کی بات نہ لگ سکی۔ زیادہ تو یہ چیز ان کے دل کو پریشان کرنے لگی تھی کہ اسد کو بھی جب یہ معلوم ہوگا کہ ابھی شمی اس کی نہیں ہو سکتی تو اس کو بھی رنج ہوگا۔

لیکن آپا کا یہ خیال باطل تھا۔ بھلا اسے کے چند روز بعد تک تو اسد اکثر و بیشتر شمی کا تعاقب کرتا رہا۔ پھر جب وہ محسوس کرنے لگا کہ ان تلوں میں تیل نہیں تو اس نے اپنی دلچسپی کی دوسری راہیں تلاش کر لیں۔

دارالخلافہ میں ایسی دلچسپیوں کی کیا کمی تھی۔ کچھ دن بعد ہی اس کو ایک ایسی سوسائٹی مل گئی جس میں لڑکے بھی تھے اور لڑکیاں بھی۔ انہی لڑکیوں میں سے ایک لڑکی اس کی نگاہ پر چڑھ گئی۔

اس لڑکی کو پیار سے تارا کہا جاتا تھا۔ تارا سب کی آنکھوں کا تارا تو نہیں تھی مگر پھر بھی کافی مقبول تھی۔ شروع میں اس نے بھی اسد کو ہلاک عشوہ کیا تھا مگر لڑکوں کے مقابلہ میں وہ تارا کو زیادہ فرمانبردار قسم کا معلوم ہوا تو اس پر مہربان ہو گئی تھی۔ اتنی مہربان کہ ایک دو لڑکیوں کو لے کر اسد کی دعوت پر صفیہ کے ہاں بھی آ گئی۔

اسد بڑا پریشان تھا کہ اپنے عزیز و اقارب سے تارا کا تعارف کس حیثیت سے کرائے۔ بہر حال اسے یہی بہانہ کرنا پڑا کہ تارا اس کے ایک بہت ہی قریبی دوست کی بہن ہے۔

اسد نے اپنی والدہ اور صفیہ سے کہا۔

جب سے میں نے تارا اور ان کی سہیلیوں سے شمی کی تعریف کی تھی۔ یہ سب بضد تھیں کہ انہیں شمی سے لاکر ملاؤں۔ آخر آج یہ لوگ آہی کودیں۔

صفیہ نے مسکرا کر کہا۔ وہ شاید کچھ شک گرفتہ ہوگئی تھی۔

اچھا کیا تم نے اسد میاں! ان کے بھائی کو نہیں لیتے آئے تم۔

اسد نے پوچھا۔

وہ کل ہی باہر چلے گئے۔ اگر میرے یہاں کے دوران قیام میں واپس آگئے تو لاؤں گا انہیں بھی۔ لیکن خالہ جان! شمی کہاں غائب ہیں؟

اسد کی والدہ بولیں۔

بھول جاؤ اسے اسد۔

اس پر تارا اور اس کی ساتھی لڑکیاں چپکے سے آپس میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائیں۔

صفیہ نے کہا۔

آتی ہی ہوگی۔ ذرا اپنے ابّا کے ساتھ بازار تک گئی ہے۔

اسد نے دریافت کیا۔

کیا خالو بھی سیدھے ادھر ہی آئیں گے؟

صفیہ مسکرا کر بولی۔

ڈرو نہیں۔ وہ بھی اس سوسائٹی میں دلچسپی لیں گے۔

وہ اسد کی سراسیمگی کو تاڑ گئی تھی۔

اسد نے ہنس کر کہا۔

میں تو ویسے ہی کہہ رہا تھا خالہ۔

صفیہ نے باہر کار کی آواز سن کر کہا۔

لو ان کی بڑی عمر ہے۔ وہ آ گئے۔

جاوید کی آمد سے اسد نے پھر قدرے سراسیمہ ہو کر کہا

ابھی آپ ذرا یہیں رہیے خالہ جان۔ چائے وغیرہ کا انتظام میں کر لوں گا۔

صفیہ نے مسکرا کر کہا۔

گھبراؤ نہیں۔ سب انتظام ہو جائے گا۔

جاوید نے دہلیز پر قدم رکھتے ہی کہا۔

توبہ کی آئندہ، شمی کو بازار کبھی نہیں لے جاؤں۔ اس لڑکی نے میرا دیوالیہ نکال دیا ... آہا۔

مگر یہاں نامانوس لڑکیوں کی شکل دیکھ کر اس کے منہ سے آہا نکل گیا۔

جاوید نے شمی سے کہا اور باہر جانے لگا۔

اچھا! تم اپنی سہیلیوں میں جا کر غپ شپ ہانکو۔ تمہاری سب چیزیں ڈرائیور سنبھال کر لے آئے گا۔

مگر شمی ان لڑکیوں کو حیرت سے دیکھنے لگی۔ کیونکہ ان میں ایک بھی اس کی جان پہچان کی نہ تھی۔

صفیہ نے جاوید سے مسکرا کر کہا۔

آپ بھاگے کہاں جا رہے ہیں۔ ان سے ملئے۔ اسد اپنی گرل فرینڈز کو لے کر آئے ہیں۔

وہ لڑکیاں تو ہنسنے لگیں۔ شمی حیرت زدہ سی ہو گئی اور اسد بوکھلا گیا۔

آخر اسد نے کہا۔

نہیں خالہ اماں! یہ میرے دوستوں کی بہنیں ہیں۔

جاوید مسکراتا ہوا واپس آ گیا۔

لڑکیوں نے بالخصوص تارا نے شمی کو حیرت و پسندیدگی سے دیکھا کیونکہ وہ ان میں رانی نظر آ رہی تھی مگر شمی کی آنکھوں

ہیں نہ حیرت تھی نہ ناپسندیدگی۔
آخر تارا بولی۔
آپ کی خالہ زاد بہن تو بہت خوبصورت ہیں اسد صاحب
جاوید مسکرا کر بولا۔
اور اسد کی خالہ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے ؟
تارا بھی مسکرانے لگی۔ اس کا تبسم دلکش تھا۔
صفیہ نے جاوید سے کہا۔
اب آپ جا سکتے ہیں۔
آپا نے کہا۔
اگر آپ کا ڈرائیور ابھی موجود ہو تو مہمانوں کے لئے کچھ کھانے پینے کو منگوا لیجئے نہ جاوید میاں۔ چائے ماما تیار کر رہی ہے
جاوید نے کہا۔
شمی کو خدا نے کچھ غیبی طاقتیں بھی عطا کی ہیں آپا۔ یہ آپ کے اور اپنی والدہ صاحبہ کے لئے بہت سی مٹھائی بھی لیتی آئی ہیں۔
شمی نے کہا

مگر میرا خیال ہے کہ چائے کے بجائے کولڈ ڈرنک زیادہ مناسب ہے کیونکہ آج گرمی زیادہ ہے۔

اسد بولا۔

نہیں شمی! کولڈ ڈرنک تارا کے مزاج کو راس نہیں آتا۔ اس سے نزلہ ہو جاتا ہے۔

صفیہ نے مسکرا کر کہا۔

آپا! مبارک ہو۔ اسد میاں کس قدر مزاج شناس ہو گئے ہیں۔

اس کے فقرے میں کنایہ تھی۔

کافی دیر تک ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ شمی کی سمجھ میں ان لڑکیوں کی شانِ نزول نہیں آرہی تھی۔ صفیہ نے اسد کے ساتھ ان لڑکیوں کے آنے کا کوئی اثر نہیں لیا تھا۔ یہی کیفیت جاوید کی تھی مگر آپا کی کیفیت ان سے مختلف تھی۔ وہ دل میں خوش تھی کہ اچھا ہوا۔ اسد اپنے ہمراہ غیر لڑکیوں کو لے آیا۔ اس سے صفیہ و شمی کی آنکھیں کھل جائیں گی کہ ان کے لڑکے کے لئے لڑکیوں کی کمی نہیں۔

آپا اور اسد نے صفیہ کے ہاں چند روز اور قیام کیا ہی

کے بعد دونوں ماں بیٹے اپنے شہر روانہ ہوئے۔ سوائے ششی کے سب انہیں اسٹیشن تک پہنچانے گئے۔ ان میں تارا بھی شامل تھی۔

ان تمام واقعات کے بعد ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا سب کی زندگی پر ڈراپ سین پڑ گیا۔ اسد اور اس کی والدہ اپنے وطن جا پہنچی۔ اسد دل میں ششی کی حسرت اور تارا کی یاد دفن کر دینے میں کامیاب ہو گیا۔ جاوید اپنے فرائض منصبی کو تندہی و کامیابی سے چلانے میں مصروف ہو گیا۔ صفیہ گھر کے دھندوں میں لگ گئی اور اپنے پیٹ میں ایک نئی جان کی پرورش کرنے لگی۔ ششی مزید تعلیم سے ہٹ گئی اور فرید سات سمندر پار مدتِ مدید کے لئے گم ہو گیا اور کبھی کبھی دل کی لاسلکی کے ذریعہ ششی کی آواز سن لیتا تھا۔

اس طرح آہستہ آہستہ اور کبھی تیزی سے وقت گزرتا رہا۔ جن سے وقت گزارا نہیں جا رہا تھا، وہ پسماندگی کے عالم میں بہت پیچھے رہ گئے تھے اور جنہوں نے وقت پر قابو پالیا تھا وہ کامران ہو گئے تھے۔

غرض ساڑھے تین سال بیت گئے۔ ان ساڑھے تین برس میں مختلف مقامات اور بے شمار افراد پر لاتعداد واقعات گزر گئے ہوں گے مگر اس قصے کے افراد پر صرف دو ہی قابلِ ذکر واقعات گزرے۔ ایک تو اسد اور نارا کی شادی ہو گئی۔

اور یہ معلوم ہونے لگا۔ گویا اسد کے لئے کبھی شمی کوئی چیز ہی نہ تھی یہ بات دوسری تھی کہ اسد کے نفس میں اب بھی شمی کہیں چھپی تنہا رہ گئی ہو۔

اور دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ ساڑھے تین سال بعد عبید بیرسٹری پاس کر کے وطن لوٹ آیا۔ اس ساڑھے تین سال میں اس کے وطن فروش اور بلیک مارکیٹ کے بادشاہ باپ نے قوم وطن کی قیمت پر نامعلوم اور کتنی دولت پیدا کر لی ہوگی۔

بہرحال عبید کے والد خان بہادر عبدالکریم کو ایک گونہ اطمینان ہوا کہ اس کا بیٹا بیرسٹری کر آیا اور وہ ہزاروں جھوٹے مقدمات کو سچا کر بتائے گا اور ہزاروں سچی باتوں کو جھٹلا کر رکھ دے گا۔ اس کے علاوہ اپنے والد کے جرائم کے خلاف قانونی مدافعت میں سپر بن جائے گا۔ کیا عجب کہ وہ اپنے والد کے دست راست گنجے کو بھی جیل سے رہائی دلوا دے۔

مگر فرید اب تک باہر ہی الجھا ہوا تھا۔ اس کی طویل غیر حاضری سے کبھی کبھی سوچنے لگتی تھی کہ فرید نے کسی یوروپین لڑکی سے دل لگا کر اپنا گھر آباد کر لیا ہوگا تاہم جب کبھی فرید کا خط اپنے ماموں کے پاس آتا تو وہ شمی کی خیر و عافیت ضرور دریافت

کر لیتا تھا۔

عبید نے باہر کے ملکوں میں بھی تعمیری کام درفاہی تحریکات کا مطالعہ کرنے کے بجائے سیاسی جوڑ توڑ، اکھاڑ پچھاڑ اور پارٹی سازشوں کا بغایہ مطالعہ کیا اور اندازہ لگایا کہ اس سرمایہ دارانہ نظام اور بورژوائی حکومت میں بھی کھلی ہوئی سیاست کے بجائے میکیاولی کی سیاست ہی کو فتح حاصل ہے اور میکیاولی کی سیاست کا سب سے بڑا مرکز ہندوستان ہے۔

چنانچہ پہلے تو عبید نے اخبارات میں سیاسی مضامین لکھے۔ اس کے مضامین وہی اخبارات چھاپتے تھے۔ جو مختلف پارٹیوں کے مفاد کے ترجمان تھے اور ان کا تعلق وطن پرستی نہ تھا۔

جب اس کا سیاسی رنگ جمنے لگا تو چند ایسے ہی سازشی اداروں کا رکن بلکہ صدر تک بن بیٹھا۔ روپے کی کمی نہیں تھی۔ پھر وہ حلال سے نہیں کمایا گیا تھا۔ اس لئے اس کا بجائے حلال رفتن کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔

میونسپلٹی کے بازیگرانہ انتخابات کا زمانہ آیا تو ایسے ارزاں مواقع اور گراں نتائج میں عبید جیسے فن کار کے آگے کون ٹک سکتا تھا۔ اس نے سازشوں کا ایسا جال پھیلایا کہ اس کی کئی

مخالف پارٹیاں مکڑی کے اس جالے میں پھنس گئیں۔

کارپوریشن کے انتخابات ایک ملک کے سیاسی عام انتخابات کا آئینہ ہوتے ہیں۔ یہ ملک ابھی دس پندرہ سال پہلے تک صحیح شعور انتخاب پیدا نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس ملک میں ایک زمانے تک اسّی نوّے فی صدی عبید آباد رہیں گے۔

بہر حال عبید نے سستے آدمیوں کے قیمتی ووٹوں سے میونسپل الیکشن کا میدان مار لیا اور وہ کونسلر بن گیا۔ کوئی بڑی بات نہ تھی۔ یہاں بھیا نتھو اور جمّن بھی اچھے ووٹ سے کامیاب ہو جاتے ہیں۔

غرض حکومت مضبوطی سے تخریبی عناصر کے ہاتھوں میں تھی۔ اس کالی فضا میں سیاہ تر عبید بہت ہی موزوں ثابت ہو رہا تھا۔ وطن کے آنسو بہہ رہے تھے۔ قوم کے ناسور سڑ چکے تھے اور ملّت کا جنازہ بڑی دھوم سے اٹھ چکا تھا۔

عبید سے بہتر آئندہ کوئی وزیر ثابت نہیں ہو سکتا۔

کسی اخبار کی یہ سرخی تھی عبید بڑا قابل اور سمجھدار انسان ہے۔ یہ عام پروپیگنڈا تھا۔ واقعی عبید لاکھوں میں فرد تھا جن ملکوں میں آزاد اور نتھری سیاست ہوتی ہے۔ وہاں ایسے افراد جیلوں

ہیں نظر آتے ہیں اور جن ملکوں میں سیاست آباؤ اجداد کی میراث
بنی ہوئی ہو۔ وہاں ایسے لوگ وزارت کرتے ہیں۔
عبید نے اپنے والد سے پوچھا۔
رزاق چچا کا کیا حال ہے؟
اس کے والد نے جواب دیا۔
ابھی تو وہ جیل ہی میں سڑ رہا ہے۔ اب تم کوئی کارروائی
کرو۔
عبید نے سوال کیا۔
دیکھئے! کوئی تدبیر لڑاؤں گا۔ اچھا! انصر کا کوئی پتہ
چلا؟
اس کا صحیح حال اب تک معلوم نہ ہو سکا۔ کوئی کہتا ہے کہ وہ
پولیس کے ہاتھ سے مارا گیا۔ کوئی کہتا ہے کہ اب تک
روپوش ہے۔
عبدالکریم نے عبید سے کہا۔
تم وزیروں سے ملاقات کا سلسلہ قائم رکھو بیٹے!
عبید نے کہا۔
کیا فائدہ! یہاں کس کی وزارت کا استحکام ہے۔ میں

تو اپنی ایک سیاسی پارٹی جلد بنانے والا ہوں جو دیکھتے دیکھتے تمام ملک پر چھا جائے گی۔

عبدالکریم کے حالی موالی میں سے ایک بولا۔

سُنا ہے کہ جو پولیس کا کتا کیا نام ہے اس کا جاوید آپ پر بھی کچھ شبہ کرنے لگا ہے۔

عبید نے اپنے باپ کی طرف سے جواب دیا۔ پھر اپنے باپ سے بولا۔

وہ کیا کر سکتا ہے ہمارا۔ اسے کھڑے کھڑے نوکری سے نکلوا سکتا ہوں۔

جاوید نے اس عورت سے شاید نکاح کر لیا ہے جسے رزاق، عبدل اور نصرو کے ذریعہ آپ نے اڑانا چاہا تھا۔ کیا وہ عورت اب بھی اس کے گھر میں ہے؟

عبید غنڈہ تو پہلے ہی تھا۔ اب باہر کی ہوا کھا کر آیا تھا۔ اس لئے کیسا باپ کا لحاظ۔

والد صاحب بولے۔

ہوگی اس کے گھر میں۔ ممکن ہے پولیس کی دھونس سے اس نے اس خوبصورت عورت پر قبضہ جما لیا ہو۔

عبید نے بستی کے متعلق کہا اور اس کے اغوا کا سین اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔

اس کی ایک لڑکی بھی تھی۔ بڑی خوبصورت اور تیکھی اب تو اس کی شادی ہو گئی ہو گی۔

باپ مسکرا کر بولا۔

تم بھی اسے اڑانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

عبید نے کہا۔

اس زمانے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ اب چاہوں تو کل اس کو اڑا سکتا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ ایک دفعہ تو اسے ذلیل کر کے رکھ دوں گا۔ چاہے اس کی شادی ہی کیوں نہ ہو گئی ہو۔

ایک شخص بولا۔

تمہیں لونڈیوں کی کیا کمی ہے عبید میاں کہ ایک ہی کا کلمہ پڑھنے لگے۔

دوسرے شخص نے کہا۔

چھوڑو عبید! اس لڑکی کا دماغ اور عرش تک پہنچ جائے گا۔ وہ سمجھے گی کہ تم جیسا قابل اور کروڑپتی باپ کا بیٹا۔ اس

کااب بھی خواہاں ہے تو وہ خود کو نامعلوم کیا سمجھنے لگے گی۔

عبید نے کہا۔

کسی روز دیکھوں گا ضرور اسے۔ اچھا ایک شخص اور تھا، جس کا نام فرید ہے۔ کئی سال ہوئے وہ مجھ سے اکڑا تھا میں نے اس کی ایسی ایسی مرمت کرائی کہ اگر پولیس نہ دوڑ پڑتی تو میرے ساتھی اس کا خاتمہ ہی کئے بغیر نہ رہتے۔

وزیر نے کہا۔

اچھا وہ بھی عبید صاحب ہی کی کاروائی تھی۔ میں یہی سوچتا تھا کہ ایسا دل گردہ کس کا ہو سکتا ہے جو ایک بڑے پولیس افسر کے بھانجے پر ہاتھ ڈال سکے۔

وزیر دو سال سے خان بہادر کریم کے پاس سیکریٹری تھا اس وقت سب وزیر ہی کے مکان پر شراب اڑا رہے تھے۔

وزیر بڑا ہی چالاک و ہوشیار آدمی تھا۔ اس کی نظر دور دور تک پہنچی تھی۔ کریم کے لئے اس نے دو سال میں ایسے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے کہ وہ اپنے سیٹھ کے لئے ناگزیر بن گیا تھا۔ بس ہر دم اسی کے ساتھ رہتا تھا۔ بارہا اس نے

حکومت کو دھوکا دے کر کریم کا مال بچانے کی کوشش کی تھی اس میں پیسہ تو برباد ہوا تھا مگر پولیس کے ہاتھ مال کم لگ سکا تھا۔

یہ اسد کون شخص ہے؟ آج کل اس کے سیاسی مضامین اخبارات میں بہت آ رہے ہیں۔

عبید نے جواب دیا۔

ایک نیا سیاسی کارکن پیدا ہوا ہے۔

وزیر بولا۔

اسے بیوی بڑی خوبصورت ملی ہے۔

عبید نے جام چڑھا کر کہا۔

اچھا! کیا اس لڑکی سے بھی زیادہ حسین ہے جس کو میں نے بھگایا تھا۔ میں تو اس لڑکی کا نام تک بھول گیا۔

وزیر نے جواب دیا۔

شمی ہے اس کا نام۔

عبید نے مستِ شباب شمی کا تصور شراب کی بدمستی میں کرنا شروع کیا۔

ہاں شمی۔ ۔ ۔ کیا اس کی شادی ہو گئی؟

وزیر نے کہا۔

یہ معلوم نہیں۔

عبید نے وزیر سے کہا۔

مسٹر وزیر! کل آپ رحمان، غفور اور صغیر کے مکان پر جا کر کچھ روپیے دے آنا۔ یہ لوگ میری پارٹی کے بہت بڑے اور سرگرم کارکن ہیں۔ ان میں سے دو ایم۔ ایل۔ اے رہ چکے ہیں۔ آپ دیکھنا اپنی سیاسی پارٹی کتنی طاقت ور بنتی ہے۔

خان بہادر کریم بولا۔

سب سے بڑی طاقت پیسہ ہے۔ اس سے تم ملک کے ملک خرید سکتے ہو۔

عبید نے کہا۔

تمام جہان کے دین و ایمان بھی خرید سکتے ہو۔

وزیر نے مسکرا کر کہا۔

دین و ایمان کوئی چیز نہیں۔ ایک مثل مشہور ہے۔ کام کر مکر سے، روٹی کھا شکر سے۔

عبید نے بوتل خالی کرتے ہوئے کہا۔

دو سال میں ہم لوگ ملک کی پوری سیاست پر چھا جائیں گے اور دوسری تمام سیاسی پارٹیاں ہمارے آگے ہتھیار ڈال دیں گی۔ پھر پورا ملک اپنا ہوگا۔ جس طرح چاہیں حکومت کریں گے۔

عبید کے دلِ ناپاک سے شمی اب تک نہیں اُتری تھی۔ وہ اس کا نام تک بھول گیا تھا مگر اس کا نفس شمی کو فراموش نہ کر سکا تھا۔ حالانکہ باہر کے ملکوں سے وہ خوب دادِ عیش دے کر لوٹا تھا۔ یہ بات ایک عبید ہی پر موقوف نہ تھی کیونکہ ہمارے ملک کے بے شمار نفس کے بھوکے لوگ باہر جاتے ہی اسی غرض سے ہیں۔

شمی بھی عجیب ہی لڑکی تھی۔ اچھی طرح جوان ہونے سے قبل ہی بہت سے نوجوانوں کے لئے دیوی بنی ہوئی تھی۔

مگر اس دیوی کی مورتی کو اٹھا کر لے بھاگنے والوں میں سے سب سے پہلا نوجوان عبید ہی تھا جس کا قسمت ساتھ نہ دے سکی تھی اور پھنسا ہوا شکار اس کے چنگل سے چھڑا لیا گیا تھا۔

اس کے بعد بلکہ شاید عبید سے بھی قبل بے کس فرید تھا جو خاموشی سے شمی کی ناوک ناز کا شکار ہو کر مدتوں تک چپ چاپ تڑپتا رہا۔ ظالم شمی نے مگر کبھی اس کے سوز دروں پر دھیان تک نہ دیا بلکہ اسے اپنی بدگمانی کا شکار بنائے رکھا۔

مگر ایک دفعہ کبھی ایسا وقت بھی آتا ہے کہ انسان سمجھ کے موڑ میں آکر واقعات پر غور کرنے لگتا ہے۔ فرید کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ عبید کے غنڈے پن سے وہ زخمی ہوا اور اس مبارک افتاد نے شمی کی آنکھیں کھول دیں۔

اس کے بعد شمی کی آنکھیں نہیں کھلیں بلکہ فرید کے لئے اس کا پُر غبار دل بھی کھل گیا لیکن حیف کہ عین اس پکی ہوئی فصل کے موقع پر فرید کو طویل مدت کے لئے بسلسلہ تعلیم باہر چلا جانا پڑا۔

اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد اس کا خالہ زاد تعلیم یافتہ بھائی اس کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہوا لگ آئندہ کے تمام اسیرانِ بلائی کامیابیوں کی توقعات کو فرید پہلے ہی لوٹ لے گیا تھا۔ اب شمی کے دل میں سوائے فرید کے کسی اور کے لئے گنجائش نکلنا محال ہو گیا تھا۔

اس کے یہ معنی نہ تھے کہ پرانی روایات کے طور پر شمی نے فرید کے لئے اپنی زندگی تیاگ دی تھی اور اس کے نام پر بیٹھ رہی تھی۔ بس اتنا ہوا تھا کہ رک کر رہ گئی تھی۔ اس کے علاوہ اسے علم کا چسکا لگ چکا تھا۔ چنانچہ اب سوائے اپنے تعلیمی مشاغل کے اسے دوسری چیزوں سے کم رغبت رہ گئی تھی۔ لیکن اب شمی بقدر ساڑھے تین سال بڑی ہو چکی تھی کیونکہ فرید کو بھی باہر گئے ہوئے اتنا ہی عرصہ ہوا تھا اور اس کے اغوا کے واقعہ پر پانچ برس گزر گئے تھے۔ گویا وہ اب اس وقت سے آج تک پانچ سال زیادہ جوان ہو گئی تھی۔ ان پانچ سال میں پانچ ہی قابلِ ذکر واقعات ہوئے تھے۔ پہلا واقعہ تو یہ کہ اس کی والدہ کا نکاحِ ثانی ہو چکا تھا۔ دوسرا واقعہ یہ کہ جاوید سے اس کی ماں کے دو بچے ہو گئے تھے۔ تیسرا

یہ کہ اسد اس سے دل ہار نے کے بعد اس کی جانب سے مسترد کر دیا گیا تھا۔ چوتھا یہ کہ عبید باہر کے ملک سے وطن لوٹ آیا تھا اور پانچواں یہ کہ فرید وطن چھوڑ کر پردیس چلا گیا تھا۔

فرید نہ صرف وطن ہی سے چلا گیا تھا بلکہ شمی کو بھی چھوڑ گیا تھا۔ شمی اس کی آمد کے دن گن گن کر تو نہیں کاٹ رہی تھی لیکن کبھی اسے خیال آتا کہ دیکھو وطن واپس آتا بھی ہے یا نہیں۔

ایک بات یہ ہوئی کہ فرید کے والدین لاہور جا کر سکونت اختیار کر لی تھی انہی کے پاس فرید کے بیشتر خطوط آتے رہتے ہوں گے۔ جاوید کے پاس تو سال میں بمشکل ایک یا دو خط آتے ہوں گے۔

اس طرح شمی کے لئے فرید تقریباً گم ہو چکا تھا۔ اب یہ معلوم نہیں کہ آیا وہ بھی اس کے لئے مر چکی تھی یا اب بھی مع اپنی فتنہ سامانی کے اتنی ہی زندہ تھی جتنی ہمیشہ سے چلی آ رہی تھی۔

آخر ایک روز صفیہ جاوید سے بولی۔

جاوید! اسّی باغی لڑکی ہے۔ اب اس کا کہیں ٹھکانا کر دینا چاہیئے۔

جاوید نے کہا۔

کس اعتبار سے باغی ہے۔ اس نے کیا کیا ہے؟

صفیہ نے جواب دیا۔

اب دیکھو نہ اس کے تقریباً ہر مہینے ہی پیغام آتے رہتے ہیں مگر وہ ہے کہ ٹس سے مس نہیں ہوتی۔

جاوید بولا۔

یہ تو بغاوت کی علامت نہیں۔ اس کے علاوہ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے کہ تم اس کی شادی کی فکر میں گھُلی جا رہی ہو۔

صفیہ نے کہا۔

لڑکیوں کی شادی کی یہی عمر ہوتی ہے مگر جیسے جیسے وہ بڑھتی جاتی ہیں۔ باتیں آنا کم ہوتا جاتا ہے۔

جاوید نے کہا۔

مجھے تمہارے نظریئے سے اختلاف ہے۔ ایک اچھی لڑکی کے لیئے ہر وقت بَر مل سکتا ہے۔

خیر میں نے تمہارے کان میں بات ڈال دی ہے۔ چند ماہ اور انتظار کرتی ہوں۔ اس کے بعد میں تو اس کا پلو کسی سے باندھ دوں گی۔

جاوید نے کہا۔

کسی سے! کیا ہر کسی سے؟

صفیہ نے کہا۔

نہیں تو۔ مگر میرا خیال ہے کہ کمشنر کے لڑکے کو پسند کر لیا جائے۔

جاوید نے کہا۔

کیا صرف اس لئے کہ اس کا والد کمشنر ہے۔ اگر بڑی جگہ ہی رشتے کی متمنی ہو تو کسی وزیر یا اسمگلروں کے کسی بادشاہ کے وہ سپرد کیوں نہ کر دی جائے۔

صفیہ مسکرا کر بولی۔

کیا وزیر اور اسمگلر برابر ہیں؟

جاوید نے جواب دیا۔

ہاں کم و بیش برابر ہی سمجھو۔

جاوید! کیا یہ ممکن نہیں کہ ملک میں کوئی بے ضرر اور

تعمیری انقلاب آجائے؟

جاوید نے کہا۔

سب کچھ ممکن ہے۔ خدا سے ہمیں بہتری کی امید رکھنا چاہئے اکثر دیکھا گیا ہے۔ کہ جب کسی جگہ کے حالات خراب ہو جاتے ہیں۔ خواہ سیاسی خواہ سماجی اور چاہے مذہبی تو غیب سے کوئی پیدا ہو جاتا ہے اور کام کر گزرتا ہے۔

صفیہ نے کہا۔

خدا جانے کیا ہو گا۔ مجھے تو اپنے ملک کے حالات سے بالکل ہی مایوسی ہو چکی ہے۔

جاوید نے کہا۔

یہی حالت میری ہے۔ ملک تقریباً تباہ ہو چکا۔ قوم مردہ ہو چکی۔ بس اب تو ایک قوت سے آس لگی ہوئی ہے

صفیہ نے پوچھا۔

خدائی قوت سے؟

جاوید نے کہا۔

خدائی قوت تو خیر ہمیشہ اپنی جگہ برقرار ہے مگر ملک میں ایک قوت ابھی اور موجود ہے۔

صفیہ نے پوچھا۔
وہ کیا قوت ہو سکتی ہے؟
جاوید نے کہا۔
یہ ابھی نہیں بتاؤں گا کیونکہ اس کے سمٹنے کے ابھی دور دور تک آثار نہیں ہیں مگر اکثر دیکھا ہے کہ جب کوئی ملک بالکل ہی تباہ ہونے لگتا ہے تو اس کی استگاری کو وہی قوت حرکت میں آتی ہے۔
صفیہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ جاوید نے روک دیا۔
کیا کیا؟
چپ رہو صفیہ۔ قیاس کو حقیقت نہ بناؤ
صفیہ نے کہا۔
مجھے تو اس کا افسوس ہے کہ ایک ہم کیا بگڑے کہ زمانہ ہم سے بگڑ گیا۔
جاوید نے کہا۔
ایسا ہی ہوتا ہے۔ کچھ اور باتیں کرو۔ شمی کالج سے آگئی ہے۔

ہر وزیر کے لئے حکومت کی جانب سے خصوصی طیارے خریدے جائیں گے اور کاروں میں ائر کنڈیشنڈ کیڈلک کار باہر سے منگوائی جا رہی تھیں۔ فلاں وزیر کو اتنے ہزار ٹن اعلیٰ قسم کے چاول کا لائسنس دیا گیا ہے اور فلاں وزیر بیرونی ممالک کی سیر کو جا رہا ہے۔ شب و روز اخبارات کی یہی خبریں تھیں۔

کیوں نہ ہو۔ بہت دولت مند اور بہت بڑا ملک ہے۔ جس کی آمدنی کا کوئی ٹھکانہ نہیں اور جس کے سیٹھ لوگوں کی

دولت کا کوئی اندازہ نہیں کیونکہ یہ دولت اس قدر مختلف ذرائع سے کمائی کی گئی ہے کہ ان کا شمار نہیں۔

اس دولت بے قیاس کا مصرف اسمگلنگ اور بلیک مارکیٹ کے سپوتوں نے وہی کیا جو ان کے شایاں تھا یعنی غیر ملکی بیش قیمت لباس، اعلیٰ درجہ کی ولایتی شرابیں اس کے علاوہ جدھر دیکھو نہایت قیمتی جدید ترین ماڈل کی کاریں چلی آ رہی ہیں اور زن سے فٹ پاتھ پر پڑے ہوئے بے گھر لوگوں کو اشتراکی جراثیم کی غذا دیتی ہوئی گزر جاتی ہیں۔

اس ملک میں بڑا بڑا سرمایہ دار اس وقت موجود ہے مگر اس عیش کے بندے اور نفس کے غلام کو کبھی رفاہی کاموں پر ایک پائی صرف کرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ یہاں جتنے پارک، یادگاریں، شفاخانے اور دوسرے ایسے ہی رفاہی مقامات ہیں وہ سب یا تو پارسیوں کے بنوائے ہوئے ہیں یا ہندوؤں کے مگر وہ قوم جو اسلام اور اسلامی جمہوریت کا ڈھول پیٹتی رہتی ہے۔ کوئی خیراتی ادارے قائم کرنا تو کجا کسی نادار طالب علم اور بیوہ کو ایک پیسہ وظیفہ دینے کی بھی روادار نہیں۔ اس کی تمام دولت اسی کی دوزخ پر چلی جاتی

بیمار رہی ہے۔

وقت جتنا گزر رہا تھا، اتنا ہی بھاری ہوتا جا رہا تھا بتاہم، کیسے لے ڈانواں ڈول ملک کی سازشیں اور حکومت کی وطن فروشی بھی کافی سے زیادہ تھی مگر باہر کے حالات اس کہیں زیادہ مہلک ہونے لگے تھے۔ ہمسایہ دشمن ممالک گھات میں آ بیٹھے تھے کہ کب مردِ بیمار بے سکت ہو اور کب اس کی لاش کی دھجیاں اڑائیں۔

مسجد میں ملاّں ہاتھ پھیلا پھیلا کر دعائیں مانگنے میں مصروف تھا، پلیٹ فارم پر واعظ کھوکھلے نعرہ ہائے تکبیر بلند کر رہا تھا مصلح دھڑا بندیوں میں پھنسا ہوا تھا اور بر خود غلط صوفی خانقاہ میں جا کر معتکف ہو گیا۔ غرض پوری ناکارہ قوم میں ایک بھی مردِ مجاہد نہ رہا تھا کہ شمشیر تولتا ہوا اٹھتا اور باطل کے پرخچے اڑا دیتا۔

دوسری طرف ریس کی گرم بازاری ہے جس کے دم ہاجوئے کے پو بارے ہیں، شرابوں کی بھرمار، ننگے ڈانس کی جھنکار، بلیک مارکیٹ اور اسمگلنگ کے سیلاب، ڈاکہ زنی، قتل، وجبل، تبلیس، خلف وردی، اغوا اور زنا کی کالی آندھی

یہ سب کچھ اسلامی لباس میں ہو رہا تھا۔ اسلامی جمہوریت میں ہو رہا تھا۔ اسلام ـــ اسلام ـــ خدا سے دعدہ سپرنگی۔

کسی لادین کو اسلام کا نام لینے کا کیا حق ہے۔ اگر ایک سپاہی قواعد، ڈرل اور فوجی ڈسپلن سے بھاگتا ہے اور اس سے سرکشی کرتا ہے تو کیا پھر بھی وہ سپاہی ہے اور کیا فوج ایسے مجہول شخص کو قبول کر سکتی ہے۔ کوئی اسلامی نظام نہیں۔ کوئی اسلامی جمہوریت نہیں۔ اگر ملک میں حقیقی مسلمان نہیں ہیں۔ اسلام گدھوں اور خچروں کے لئے نہیں ہے۔

لندن کے ہائڈ پارک میں ایک مرتبہ فرید نے کچھ اس قسم کا لیکچر دیا تھا اور اس کی نقول جب اس "اسلامی ملک" کے اخبارات میں آئیں تو ملک والوں نے گریباں میں منہ ڈالنے کے بجائے آسمان پر تھوکنا شروع کیا۔

باہر کے ملکوں میں فرید اپنے تعلیمی مشاغل کے ساتھ ساتھ سماجی اور معاشی مسائل میں بھی بغایت دلچسپی لیتا رہا۔ ان موضوعات پر اس کے مضامین اس کے ملک کے اخبارات ورسائل میں بھی نقل ہوتے تھے جس سے ملک کا ایک طبقہ

اس کی قدر کرنے لگا تھا۔ ہر سال باہر جا کر بھی وہ اپنے وطن وانغانئے وطن کو نہیں بھولا تھا۔ اس کے سینے میں خدمات کے جذبات اب بھی موجود تھے۔

اس طرح اسے باہر گئے ہوئے ساڑھے چار سال گزر گئے۔ شمی اب بھی کنواری تھی۔ اگرچہ اس پر شادی کے پیغامات کے یلغار بدستور ہو رہے تھے۔

انتظار ——— یہ انتظار نہ تھا بلکہ شاید یہ اپنی ذات کے خلاف شمی کی ضد کا مظاہرہ تھا کہ اس کے آگے صفیہ و جاوید بھی عاجز آ چکے تھے۔

آخر ایک روز صفیہ نے اسے نوٹس سا دے ڈالا۔ شمی خاموش ہو گئی۔

سن لو شمی! اگلے ماہ میں تمہاری منگنی ایک اعلیٰ خاندان میں کر رہی ہوں۔ لڑکا بھی بہت اچھا ہے اور تعلیم یافتہ بھی۔

جاوید بھی مسکرا کر بولا۔

اب خاموش کیوں ہو گئیں۔ تم تو رقعوں کے ذریعہ اپنی والدہ کو دو ٹوک جواب دینے کی عادی تھیں۔

شمی اٹھ کر جانے لگی۔
صفیہ نے مسکرا کر کہا۔
بیٹھ جاؤ شمی! اگر تم اپنے ابا سے شرما رہی ہو تو میں
انہیں یہاں سے بھگائے دیتی ہوں۔
جاوید نے پھر مسکرا کر کہا۔
جانے دو شمی کو، وہ رقعہ لکھنے جا رہی ہے۔
شمی اٹھ کر چلی گئی مگر صفیہ نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔
ساتھ ساتھ وہ بھی چلی گئی۔
کمرے میں جا کر شمی نے صفیہ سے کہا۔
آخر آپ کو میرے متعلق اس قدر تشویش کیوں
ہے امی؟
صفیہ نے کہا۔
قدرتی بات ہے۔ مجھے تمہاری فکر نہ ہو گی تو
کسے ہو گی۔
شمی نے کہا۔
کاش! اس ناکچھ بات کے بجائے آپ کوئی تعمیری
فکر اپنے سر لیتیں۔

صفیہ مسکرا کر بولی۔
تو تم بتا دو۔
شمی نے قدرے تلخی سے کہا۔
میں بتا دوں! کیا آپ کو نظر نہیں آ رہا ہے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔
صفیہ نے کہا۔
میں تمہارے ان مبارک جذبات کی قدر کرتی ہوں مگر شکر ہے کہ ابھی ملک میں ایسے افراد بھی موجود ہیں جو اصلاح کے باب میں اپنی ناتواں کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک جاوید بھی ہیں۔
شمی نے کہا۔
اور اگر فرید آ گئے تو وہ بھی اچھے لوگوں کا ہاتھ بٹانے میں معاون ہوں گے لیکن امی یہ کام محض چند نفوس کا نہیں بلکہ پوری قوم کا ہے۔ بلاشبہ قوم اپاہج کر دی گئی ہے اور یاس کا شکار بنا دی گئی ہے۔ پھر بھی اگر ایک باہمت جماعت اٹھ کھڑی ہو تو یہ گندہ سیاسی نظام ختم ہو سکتا ہے۔

صفیہ نے کہا اور چل دی۔

ششی! میں تم سے ملکی مسائل پر بحث کرنے کے لئے کمرے میں نہیں آئی ہوں بلکہ اپنا فیصلہ سنانے آئی ہوں۔ اگلے ماہ تمہاری منگنی ہو جائے گی۔

ششی نے بھی اپنا فیصلہ سنا دیا۔

سُنئے امّی! منگنی ایک جاہلانہ رسم ہے۔ خیر اگر اس کو میں آپ کی خاطر انگیز بھی لوں تو اس کے آخری مرحلہ کے لئے جلدی نہ کیجئے۔ میں عہد کر چکی ہوں کہ جب تک ملک بہتری کی طرف نہیں آجائے گا، میں شادی بیاہ نہیں کروں گی۔

بہر حال اس کے اس فیصلہ کے باوجود اگلے ماہ اس کی منگنی ہو کر رہی۔ دُلہا والوں کے ہاں سے بہت سا میوہ، کپڑے اور انگشتری وغیرہ آئی مگر ششی نے ان میں سے کسی چیز کی طرف نگاہ تک اٹھا کر نہیں دیکھا۔

اس گندے ملک کی گندی سیاست، ناپاک سماج اور غلیظ ماحول میں نجاست مجسّم عبید بہت ترقی کر گیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ نہیں بلکہ تیزی سے ملکی سیاست پر چھا گیا تھا۔ روپیہ، دجبل، ابلیسی پارٹیاں یہی چیزیں اسے جلدی اٹھا دیں۔ غلاظت ہی میں کیڑے مکوڑے پروان چڑھتے ہیں۔ صاف ہوا اور دھوپ میں وہ زندہ نہیں رہتے۔

مگر ابھی سورج نہیں نکلا تھا کہ دھوپ پھیلتی۔ ابھی ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا اور ظاہر ہے کہ تاریکی ہی میں جرم

گناہ کے کثیر مواقع رہتے ہیں۔

منگنی ہونے کے بعد چند ماہ بعد ہی دولہا والوں نے شادی کا تقاضا شروع کیا۔ اب شمی بگڑ کھڑی ہوئی۔

شمی نے غصہ سے پوچھا۔

کیا امّی آپ نے ان لوگوں سے یہ وعدہ کر لیا تھا کہ جی چاہے جب وہ آخری مرحلہ کا تقاضا کر سکتے ہیں؟

صفیہ نے ملائمت سے کہا۔

نہیں بیٹی! مگر وہ لوگ اپنے مطالبہ پر حق بجانب ہیں۔

شمی نے خفگی سے کہا۔

حق بجانب ہیں؟ دیکھتی ہوں وہ میرا کیا بگاڑتے ہیں۔

صفیہ چیخ کر بولی۔

یہ بگاڑ نہیں ہوگا بناؤ ہوگا۔ شمی! تمہاری گستاخی حد سے بڑھتی جا رہی ہے۔

صفیہ کے چیخنے کی آواز سن کر جاوید بھی کمرے میں آ گیا۔

کیا بات ہے۔ کیا بات ہے۔ اس مسرور گھر میں یہ چیخ پکار کیسی ؟

صفیہ نے اپنے شوہر سے کہا۔ اس کے خوبصورت چہرے پر غصہ تھا۔

جاوید: کیا تم ان سے سمجھا نہیں سکتے کہ والدین کی حکم عدولی نہ کریں۔

شمی نے بھی مڑ کر جاوید سے کہا۔

اور ابا کیا آپ امی کو فہمائش نہیں کر سکتے کہ یہ میرے پیچھے نہ پڑا کریں۔

جاوید ہنسا۔

اس نے کہا۔

دونوں کے سوالات غلط ہیں۔ فہمائش و تنبیہہ تو ناسمجھ لوگوں کو کی جاتی ہے۔ تم دونوں ناسمجھ نہیں ہو۔

شمی! میں تمہاری دشمن نہیں ہوں کہ ——

جاوید نے صفیہ کا قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

لیکچر بند۔

جاوید نے شفقت سے شمی سے کہا۔

انہوں نے نظر اٹھا کر اپنے پدر مہربان کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں سے غصہ زائل ہو گیا۔

اس بار جاوید علاوت سے اپنی بیوی سے مخاطب ہوا!

صفیہ!

ان کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔

اچھا دیکھئے ابّا

جاوید نے شمی کی گفتگو کاٹ کر کہا۔

مجھے کچھ دیکھنا بھالنا نہیں ہے۔ بات وہی ہوگی جس سے ضد بحث نہ بڑھے۔

شمی نے دریافت کیا۔

میں تو آپ سے دریافت کرنا چاہتی تھی کہ آیا کیا مسلمانوں میں کوئی ایسا ادارہ نہیں ہے جس میں شامل ہو کر لڑکیاں راہبانہ زندگی گزار سکیں؟

جاوید مسکرانے لگا۔

جاوید نے کہا۔

تمہاری امّی تمہیں ناسمجھ تصوّر کرنے میں حق بجانب ہیں شمی!

شمی بولی۔

کیوں؟

جاوید نے کہا۔

کیونکہ اسلام میں رہبانیت سخت ممنوع ہے۔ اسلام تو ایک حرکت کا نام ہے۔ دائمی و ابدی حرکت۔ راہبہ بننے کا خیال کرنے کے بجائے تم پانچوں وقت کی نماز خشوع و خضوع سے شروع کر دو اور با معنی قرآن پڑھا کرو۔

صفیہ نے مسکرا کر جاوید سے کہا۔

لیکن ملاں جی! تم نے اپنی باتوں میں اصل موضوع کو گم کر دیا۔

اب وہ اپنی صحیح موڈ میں آگئی تھی۔

جاوید نے کہا۔

اس موضوع کو اس وقت تک ختم سمجھو۔ صفیہ جب تک شمی اس میں دلچسپی لینے کو آمادہ نہ ہو۔

شمی نے تشکرانہ جاوید کی طرف دیکھا۔

جاوید اپنی بیوی سے کہا۔

میرے اس فیصلہ کو تم اپنی شکست نہ سمجھو بلکہ اصل میں یہ تمہاری

جیت ہے۔

بہرنوع دوسرے روز سے شمی نے نماز شروع کر دی اور اور دن میں کسی وقت قرآن بھی لے کر بیٹھ جاتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی عشاء کی نماز کے بعد کوئی وظیفہ بھی کھینچنے لگی۔

معلوم نہیں یہ اس کے وظیفہ کی برکت تھی یا فرید بیرونی ملک میں اپنی تعلیم اور ٹریننگ ختم کر چکا تھا کہ شمی نے وظیفہ شروع کرنے کے اکیس روز بعد وہ کھنچا ہوا وطن آ گیا۔

فرید تقریباً ساڑھے پانچ سال بعد وطن لوٹا تھا اور جو بردباری ابتدائی جوانی سے اس کے چہرے پر نمایاں تھی، وہ اب اور پختہ ہو گئی تھی۔ ساتھ ہی علم کے باوقار نقوش بھی اس کے چہرے پر پیدا ہو گئے تھے۔

مگر چونکہ فرید کے والدین کچھ عرصہ پہلے لاہور جا بسے تھے۔ اس لئے وہ بھی انہی کے پاس چلا گیا۔ دارالخلافہ نہ آ سکا۔

باہر سے ایک کام کا آدمی بن کر آیا تھا اور نام بھی ساتھ لایا تھا۔ لہٰذا اس کے واردِ وطن ہونے کی خبر اخبارات میں شائع ہو گئی۔ یہ خبر جاوید و سفینہ کی نظر سے بھی گزری۔ اس کے آ

جانے کی انہیں بھی خوشی ہوئی۔ شمی کے جذبات کا پتہ نہیں کہ اس نے فرید کی مراجعت کا کس طرح خیر مقدم کیا۔ البتہ اس کا وظیفہ تھوڑا سا اور لمبا ہو گیا تھا۔

وطن پہنچ کر فرید نہ تو کسی سرکاری ملازمت کا خواہاں ہوا نہ غیر سرکاری نوکری کا بلکہ اس کا قصد پریس جاری کرنے کا تھا تاکہ آزادی سے اپنے ملک کی خدمت کر سکے۔

مگر پریس اور اس کے آرگن کے لئے کافی سرمایہ کی ضرورت تھی اور اس کی تعلیم کے سلسلہ میں اس کے والدین میں اب اتنی مالی سکت نہیں رہی تھی کہ مزید بڑا خرچ برداشت کر سکتے۔

اس کے علاوہ اس کے ماموں جاوید کے پاس بھی

رشوت کا پیسہ نہیں آتا تھا۔ اس لئے وہ بھی فرید کی مزید مالی امداد سے قاصر تھا۔ رہے ملک کے اہل سرمایہ تو انہیں تعمیری کاموں سے کیا سروکار۔ شاندار کاریں، کوٹھیاں عیش و عشرت سے جو روپیہ بچتا تھا۔ اسے یا تو ریس کے گھوڑے کھا جاتے تھے یا ان کے بھگوڑے دوست واحباب۔

آخر پیٹ سے بیگار بھلی کے خیال سے اس نے ایک کالج کی پروفیسری کر لی۔ ویسے بھی اس کے رفاہی جذبات کو دیکھتے ہوئے یہ اس کی صحیح لائن تھی کیونکہ طلباء ہی کا ایک ایسا طبقہ تھا کہ اگر ابتداء ہی سے اس کو صحیح سانچے میں ڈھال دیا جائے تو شورش و سیاسی ہنگاموں میں پڑنے کے بجائے وہ اعلیٰ درجہ کا خادم خلق ثابت ہو سکتا ہے۔

وطن پہنچنے کے تین چار ماہ بعد آخر وہ اپنے ماموں اور ممانی سے ملنے کے لئے دارالخلافہ آیا۔ ان سے ملنے کے علاوہ اس کے تحت الشعور میں اب بھی شمی موجود تھی۔ فرید نے باہر کے ملکوں میں شمی سے بہتر لڑکیاں دیکھی ہوں گی لیکن شمی کے باب میں فرید کی کیفیت اس مصرع کی مصداق ہوگئی۔

کیا جانے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

فرید نے جس آن میں شمی کو دیکھا تھا۔ بے شک اس سے اس کا دل ٹوٹ گیا تھا اور یاس غالب آ گئی تھی۔ پھر بھی ایک موہوم اُمید کا کچا سا تاگا اس کے دماغ میں ملنے لگتا تھا کہ طویل جدائی کے بعد ممکن ہے اب شمی خوش خلقی سے پیش آئے مگر فرید کو ایک کھٹکا اور لگا ہوا تھا بلکہ اس نے کافی مضبوط ایک قیاس یہ قائم کر دیا تھا کہ شمی کی شادی ہو چکی ہو گی بلکہ اس کی گود میں ایک دو بچے بھی کھیل رہے ہوں گے۔

اپنے اس قیاس وہ ایک حد تک حق بجانب تھا کیونکہ جاوید کے خطوط جتنے بھی فرید کے پاس گئے تھے۔ ان میں شمی کا کوئی ذکر نہ تھا حالانکہ فرید اپنے ہر خط میں شمی کی خیر و عافیت دریافت کر لیتا تھا۔

بہت سے تحفے لے کر اتوار کو دن میں فرید اپنے ماموں کے مکان پر پہنچا۔ سب گھر ہی موجود تھے۔ جاوید پر تو ہر وقت ڈیوٹی سوار رہتی تھی۔ اس وقت بھی وہ وردی ڈاٹ کر کہیں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ صفیہ اخبار یا رسالہ پڑھ رہی تھی اور شمی اوپر کے کمرے میں پڑھتے پڑھتے ذرا سی نیند میں ڈوب گئی تھی۔

فرید نے داخل ہو کر کہا۔
السّلامُ علیکم ماموں جان والممانی جان!
جاوید نے مسرت سے کہا۔
ہلو فرید!
اور اس سے بغلگیر ہُوا۔ صفیہ بھی رسالہ پھینک کر مسکراتی ہوئی قریب آئی اور اس کے پیچھے پیچھے اس کا بڑا بچہ۔
صفیہ نے بھی خوش ہو کر کہا۔
ماشاء اللہ! تمہاری تندرستی بہت اچھی ہو گئی ہے اور اچھے نظر آرہے ہو۔
جاوید نے بچے کو دیکھ کر کہا۔
آپ کا مزاج اچھا ہے ممانی۔ ارے آپ کی تعریف؟
اور لپک کر گود میں اٹھا لیا۔ جاوید و صفیہ ہنسنے لگے۔
صفیہ مسکرا کر بولی۔
ان سے چھوٹی ایک تعریف اور بھی ہے۔ وہ ذرا اپنی آپا کے ساتھ باہر تشریف لے گئی ہے۔
فرید نے شمی کے متعلق دریافت کیا۔
خوب! ماشاء اللہ!! لیکن ممانی جان سب سے بڑی ایک

تعریف اور تھی نہ وہ کہاں غائب ہے ؟

جاوید نے مسکرا کر جواب دیا۔

وہ اوپر ذرا نیند نکال رہی ہے۔

صفیہ نے ماما سے کہا۔

جانا ماما۔ سشمی کو جگا کر لے آؤ۔ کہنا مہمان آئے ہیں۔

ماما نے اوپر جا کر سشمی کو جگایا۔ وہ بیزاری سے اٹھ بیٹھی۔

ماما نے کہا۔

بیگم صاحب بلا رہی ہیں آپ کو چھوٹی بیگم۔

سشمی نے کہا۔

جاؤ مجھے سونے دو۔

ماما نے کہا۔

مگر بیگم صاحب نے کہا ہے کہ مہمان آئے ہیں۔

شمی نے کہا اور پھر دراز ہو گئی۔

گولی مارو ان کے۔ جاؤ میں نہیں آتی۔

ماما آخر مایوس ہو کر چلی آئی۔

صفیہ نے ماما سے پوچھا۔
نہیں آئیں؟
ماما نے جواب دیا۔
نہیں بیگم صاحب! وہ تو خفا ہونے لگیں۔
صفیہ نے کہا۔
جاؤ پھر بلا کر لاؤ۔ تم نے کہا نہیں کہ مہمان آیا ہے۔
ماما نے سمی کے الفاظ دہرا دیئے۔ صفیہ خوب ہنسی۔
کہا تھا بیگم صاحب مگر وہ کہنے لگیں کہ گولی مارو مہمان کے۔
صفیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔
ارے! اُسے یہ مغالطہ ہوا ہوگا کہ نیاز آئے ہیں۔
فرید نے دل میں کہا۔
اچھا تو سمی کے شوہر کا نام نیاز ہوگا مگر وہ اس غریب سے اتنی بیزار کیوں ہے کہ اس کے گولی مار رہی ہے۔
خیر ہو گئی سمی کی شادی۔ دیکھو کیسے صبر آتا ہے۔ فرید سوچ رہا تھا۔
سمی کی شادی کے متعلق صفیہ سے فرید سوال کرنے ہی

ہوا تھا کہ کمرے کی دوسری طرف کا پردہ اٹھا اور شمی نمودار ہوئی۔ بال بے ترتیب، لباس ڈھیلا ڈھالا۔ سوا کے اٹھنے سے چہرے پر اور نکھار اور فتنہ ساماں، آنکھوں میں اب تک نیند کا خمار۔ اللہ! یہ شمی ہے۔

فرید کے دل نے چیخ کر کہا۔

شمی کو بھی پہلی نظر میں کوئی اجنبی سا نوجوان کرسی پر بیٹھا ہوا نظر آیا جو اسے دیکھ کر آداب کے طور پر اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اسے دیکھے جا رہا تھا۔

آخر شمی نے فرید کو پہچان لیا۔

کون فرید — فرید بھائی! ارے آپ!

فرید نے مسکرا کر دریافت کیا۔

کیا شمی صاحبہ میں اس قدر بدل گیا ہوں۔

شمی بھی مسکرانے لگی۔

فرید نے ہنس کر کہا۔

کیا شمی گولی مارنے کے لئے اپنا پستول دوں؟

صفیہ اور فرید بھی ہنسنے لگے اور شمی کھسیانے پن سے مسکرانے لگی۔

صفیہ نے جاوید سے کہا۔
بیٹھ جاؤ نہ جاوید۔ تھوڑی دیر بعد چلے جانا۔
جاوید نے مسکرا کر کہا۔
ہاں اب تو بیٹھنا ہی پڑے گا۔
فرید کو بڑی خوشی ہوئی کہ شمی نے خلافِ توقع اس کا خیر مقدم خوش خلقی سے کیا۔
صفیہ نے چائے کے دوران کہا۔
اچھا! اب اپنی سیاحت کے جستہ جستہ حالات سناؤ فرید۔
جاوید نے مسکرا فرید سے دریافت کیا۔
پہلے یہ بتاؤ شادی کر لی تم نے؟
فرید نے کہا۔
پہلے آپ بتائیے کہ شمی صاحبہ کو کیسا میاں ملا؟
جاوید مسکرا کر بولا۔
یہ تو وہی بتا سکتا ہے جسے میاں ملا ہو؟
صفیہ بھی مسکرا کر بولی۔
ہاں بھیا جاوید کیوں بتائیں؟

اس بار فرید نے شمی سے سوال کیا۔

کیوں شمی صاحبہ! کیسے ہیں وہ بزرگ؟

شمی ماتھے پر بل ڈال کر خاموش ہوگئی۔

افسوس! یہ شادی کچھ خوشگوار معلوم نہیں ہوتی مگر ماموں اور ممانی کو کیا ہوگیا تھا کہ ایسے گوہر بے بہا کو کیچڑ میں ڈال دیا۔ شمی کو خاموش دیکھ کر فرید تاسف سے سوچنے لگا۔

صفیہ نے کہا۔

اچھا! تم بیاہ شادی کے قصے کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ وطن آکر کیا مشغلہ اختیار کیا تم نے؟

فرید نے مسکرا کر جواب دیا۔

ابھی تو کالج کے اصطبل میں بندھ گیا ہوں۔ آگے دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

جاوید نے دریافت کیا۔

تمہارا اسباب وغیرہ کہاں ہے؟

فرید نے کہا۔

میں تو کھڑے کھڑے آیا تھا ماموں۔ بس یہ چلا۔ سہ پہر کی گاڑی سے واپس جا رہا ہوں۔ اچھا ہے آپ سب مکان

ہی پر مل گئے کہ ملاقات ہو گئی۔

اس بار شمی صاحبہ بھی بولیں۔

یہ تو محض راہ پیمائی ہوئی۔

فرید نے مسکرا کر شمی کو جواب دیا۔

جی ہاں ! دشت پیمائی کرتا رہا ہوں۔ اس لئے راہ پیمائی کی کچھ عادت سی ہو گئی ہے۔

اس کے بعد فرید نے لائے ہوئے سب کو دیئے۔

فرید نے کہا اور اجازت چاہی۔

آپ نے معافی جان چونکہ دونے چراغوں کی آمد سے مجھے مطلع کرنے میں بخل سے کام لیا تھا۔ اس لئے افسوس ان کے لئے کچھ نہ لا سکا۔ اب لاہور پہنچ کر ان کے لئے بہت سے کھلونے بھیج دوں گا۔

جاوید بولا۔

یہ تو کچھ نہ ہوا فرید ! ہمارا تو خیال تھا کہ پانچ ساڑھے پانچ سال کے بعد لوٹے ہو تو کچھ دن تو ہمارے پاس رہو گے۔

صفیہ نے اصرار کیا۔

اچھا کچھ کھا پی تو لو۔

فرید نے معذرت چاہتے ہوئے کہا۔
نہیں ممانی دیر ہو جائے گی سب مجھے ان دو گھنٹوں میں اور کئی ضروری کام کرنے ہیں۔
جاوید نے دریافت کیا۔
تمہارے ابا اماں تو بخیریت ہیں؟
فرید نے جواب دیا۔
جی ہاں! سب خیریت سے ہیں۔
اس کے بعد بیگ اٹھایا اور سب کو آداب کر کے رخصت ہوا۔ ایک نظر شمی کو بھی دیکھ لیا۔ شمی کے لبوں پر یہ سوال آتے آتے رہ گیا کہ اب کب آئیں گے۔

غرض فرید کو وطن آئے ہوئے ایک سال ہو گیا۔ وہ محبانِ وطن کی جماعت میں کافی مقبول تھا مگر محبانِ وطن کی جماعت تھی کتنی سی۔ تمام مختلف قسم کی سیاسی پارٹیوں میں پھنسا ہوا تھا اور یہی پارٹیاں تمام افراد پر چھائی ہوئی تھیں۔ ہر پارٹی اپنے اپنے مفاد کے لڈوؤں پر جھپٹ رہی تھی۔ تمام وزراء ذاتی غرض، جوڑ توڑ اور ایک دوسرے کے خلاف سیاسی سازشوں میں لگے ہوئے تھے۔ ملک کا دیوالیہ نکل گیا تھا۔ سرحدیں سکڑ رہی تھیں اندر ملکی اقتصاد پر انڈاپا چھا چکا تھا غرض

پورا کا پورا ملک آخری ہچکیاں لے رہا تھا۔ بس ایک تسمہ لگا رہ گیا تھا جو آخری ضرب کا انتظار کر رہا تھا۔

ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا، ہر طرف سخت تاریکی، زمین تاریک، آسمان تاریک اور انسانوں کے ضمیر و روح تاریک، یہ معلوم ہوتا تھا گویا اس ملک کا سورج کہیں گم ہو گیا یا مشرق و مغرب کی حدود سے آوارہ ہو کر سمندر میں ڈوب مرا تھا۔

مگر ایک نصف شب کو یکایک کڑاکا ہوا جس سے ابا طیل اوندھے منہ گر گئے اور وزراء کے ہاتھوں میں جام بلوریں تھرّا اٹھے۔ یہ کسی طوفان کی کڑک نہ تھی بلکہ رحمت کی ایک للکار تھی کیونکہ اس نصف شب کے بعد اس سے کوئی ایسی قسم کی رات پیوست نہیں ہوئی بلکہ لامتناہی تاریکیوں کا تسلسل ٹوٹ گیا تھا اور آج مدت کے بعد سویرا ہوا تھا اصل معنی میں سویرا۔

مسلسل اندھیرے کے بعد اجالا پھیلا اور لوگ مسرت سے چیخ اٹھے، آفتاب نکل آیا، آفتاب نکل آیا۔ یہ محض نمودِ سحر نہ تھی بلکہ مستقل روشنی تھی۔ نور تھا!

ملک کی فدائی فوج کو آگ بجھانے کے لئے کودنا پڑا۔

وہ اس طرح کودی کہ بڑے بڑے بت خانے اور لات و منات سے بھی زیادہ مضبوط و مغرور بت اوندھے منہ زمین پر گر گئے اور پاش پاش ہو گئے۔

فوج کا کام دشمنوں کو کچلنے کا ہے۔ میدانِ جنگ ہی میں نہیں بلکہ اندرونِ خانہ بھی۔ اس فوجِ ظفر موج نے سیاسی ہیکلوں کو توڑ مروڑ کر پھینک دیا اور وطن فروش سیاسی پارٹیوں کو زمین میں دفن کر کے تمام نظم و نسق خود سنبھالا۔ وطن کے سسکتے جسم سے دعا نکلی اور آسمان سے مرحبا کی صدا آئی۔

مارے خوشی کے وطن کی یہ حالت تھی جیسے مرقد سے جی اٹھے ہوں اور بلیک مارکیٹ والوں، اسمگلروں، مفاد پرستوں وغیرہ اندوزوں اور غداروں کی یہ کیفیت ہوئی گویا ان کی قبروں میں کیڑے پڑ گئے ہوں۔

یہ وطن کی فوج رزم و بزم دونوں کی بادشاہ ثابت ہوئی۔ رزم میں یہ تو شیرِ غراں تھی ہی، بزم میں بھی اس نے وہ کارہائے نمایاں کئے کہ بڑے بڑے سیاسین انگشت بدنداں رہ گئے۔

بے شک اب بھی فوج کے سامنے لاتعداد کام پڑے ہوئے تھے بلکہ ابھی تو کام کا آغاز ہی ہوا تھا کیونکہ الجھ دس

سال کی بنجر زمین کو زرخیز بنانے کے لئے ڈگنی ملنت درکار ہے۔

فوجی انقلاب سے چند ماہ قبل ہی عبید بے الیمان کیبنٹ میں ایک وزیر بن گیا تھا۔ اُس فرسودہ و گندی سیاست میں عبید کا وزیر بن جانا عین حالات کے مطابق تھا مگر اب اس کی اور تمام اسی جیسے عناصر کی وزارت دھری کی دھری رہ گئی تھی۔

اب فرید اور جاوید جیسے فدایانِ وطن و فرض شناس نفوس کا زمانہ تھا۔ چنانچہ حالات بدلتے ہی بوسیدہ سیاست کا تختہ لوٹتے ہی اور مفاد پرست و غدارانِ قوم پر تباہی آتے ہی جاوید نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ خان بہادر کریم کو گرفتار کر لیا۔

عبید اور اس کے غارتِ قوم باپ، اس کے رفقاء اور انہی جیسے لاتعداد افراد جن سے ملک بھرا پڑا تھا جاوید کی دسترس سے نہ بچ سکے۔ کیونکہ اب جاوید آزاد تھا۔ جن منصبی فرائض ادا کرنے کی پاداش میں اس معطل کرنے کی دھمکی اب تک دی جاتی رہی تھی۔ اب انہیں پورا کرکے وہ

روحانی سکون محسوس کر رہا تھا۔

جاوید نے ایک کریم ہی کو گرفتار کر کے لاکھوں کروڑوں روپیے کا مال برآمد کر لیا۔ اس کے علاوہ اور بڑے بڑے مسلمان مہاجن، سیٹھ، ساہوکار پکڑے گئے۔ کیونکہ وہ یہودی سے کم نہ تھے اور شیطان سے بھی پست تر ہو چکے تھے۔

ان کارہائے نمایاں کے صلہ میں چند ماہ بعد ہی نئی حکومت نے جاوید کو آئی جی پولیس بنا دیا جس کا وہ مدت سے مستحق تھا۔

اپنے ماموں کو اس ترقی کی مبارک باد دینے فرید بھی لاہور سے آگیا۔

فرید نے صفیہ سے مسکرا کر کہا۔

مبارک ہو ممانی صاحبہ!

جاوید نے ہنس کر کہا۔

یہ ایک ہی رہی۔ جان میں نے گھلائی اور مبارک باد تم صفیہ کو دے رہے ہو۔

فرید نے ہنستے ہوئے کہا۔

اصل مبارک کی مستحق ممانی ہی ہیں کیونکہ وہ آپ کے لئے

مبارک ثابت ہوئیں کہ گھر میں آتے ہی آپ ایس۔ پی ہو گئے
پھر آپ کو دو پیارے پیارے بچے ملے۔ (شمس کو) پھر انہوں
نے ایک سعید و بابرکت فوجی انقلاب پیدا کیا اور اب آپ کو
آئی جی بنا دیا۔ ہاں بے شک ممانی نے اب تک میرے لئے کچھ
نہیں کیا ہے۔

شاید فرید کا اشارہ شمی کی طرف تھا۔ جاوید ہنستا
رہا۔

چند ماہ پیشتر جب وہ کھڑے کھڑے یہاں سب سے
ملنے آیا تھا تو اسے یہ بات واضح نہ ہو سکی تھی کہ آیا شمی کی شادی
ہو چکی ہے یا نہیں بلکہ جو چند باتیں اس نے یہاں سنی تھیں،
ان سے اندازہ یہی لگایا گیا تھا کہ اس کی شادی ہو چکی ہے۔
اور غالباً اسے حسب منشا شوہر نہیں ملا۔

چند منٹ کے لئے تو وہ آیا ہی تھا۔ اس میں دوسری
باتیں چھوڑ کر اصرار کرکے تو جاوید و صفیہ سے دریافت کرنے
سے رہتا کہ شمی کی شادی کب ہوئی۔ بہرحال وہ اسی مغالطہ
میں مبتلا تھا کہ شمی غیر کی ہو چکی ہو گی۔

آخر جاوید نے کہا۔

ہاں میاں فرید! تم ٹھیک کہتے ہو۔ تمہاری ممانی نے مجھے تو نہال کر دیا مگر تمہیں اب تک کچھ نہیں دیا۔

صفیہ مسکرا کر بولی۔

فرید کو بھی اپنی قسمت کا مل جائے گا۔

فرید نے یونہی دریافت کر لیا۔

کیا شمیم صاحبہ کالج سے نہیں آئیں ابھی؟

جاوید نے مسکرا کر فرید سے کہا۔

بڑے اہتمام سے نام لیتے ہو اس کا۔

صفیہ نے مسکرا کر کہا۔

ہاں شمی بڑی جو ہے فرید سے۔

پھر فرید سے بولی۔

اس دفعہ اپنا اسباب کہاں رکھ آئے یا آج بھی راستہ ناپنے کو آئے ہو؟

فرید نے جواب دیا۔

نہیں تو۔ اب کی دفعہ تین چار روز قیام رہے گا میرا۔

جاوید نے کہا۔

اچھا فرید ہیں اور تمہاری ممانی تو پارٹی میں جا رہے ہیں۔

اس دوران میں تم اپنا اسباب وغیرہ یہیں لے آنا۔

صفیہ نے جاوید سے کہا۔

جاوید! مجھے اپنے ساتھ نہ گھسیٹو۔ وہ تمہارے عملہ کی پارٹی ہے۔ میں کیا کروں گی جاکر۔

جاوید نے کہا۔

واہ! وہاں اور بھی خواتین ہوں گی۔ اس کے علاوہ میرے میزبانوں نے باصرار کہا ہے کہ مسز کو ضرور ساتھ لانا۔

آخر صفیہ تیار ہو گئی۔ اس نے کوئی زرق برق لباس زیب تن نہیں کیا بلکہ سادہ ملبوسات ہی میں چلی گئی۔

ادھر فرید بھی روانہ ہوا۔ اسے ملکی وفاع کی سوسائٹی کے چند افراد سے ملنا تھا اور پروگرام بنایا تھا کہ عوام کی اصلاح کے ساتھ ساتھ نئی حکومت کے تعمیری کاموں میں حصہ لینے کے کیا ذرائع اختیار کئے جائیں۔

ان سب کاموں میں اس کا ایک گھنٹہ صرف ہو گیا۔ وہ زیادہ وقت دیتا مگر اپنے ماموں کے ہاں اسباب پہنچانا تھا۔ اس لئے جلدی ہی اسباب لے کر جاوید کے مکان پر آ گیا۔

صفیہ و جاوید اب تک پارٹی سے نہیں لوٹے تھے۔ البتہ شمی کالج سے آگئی تھی۔ فرید کو اسباب بدوش دیکھ کر اسے تعجب ہوا کہ یہ کب آگیا۔

شمی نے دریافت کیا اور اس کی آنکھوں میں ہلکی ہلکی مسرت پیدا ہو گئی۔

اچھا! کب آئے آپ لاہور سے۔ کیا ابھی چلے آرہے ہیں؟

فرید نے دریافت کیا۔

سہ پہر کو یہاں ایک چکر لگا گیا ہوں۔ ممانی اور ماموں پارٹی میں اس وقت تک نہیں گئے تھے۔ مجھ سے کہہ گئے تھے کہ اپنا اسباب اٹھا لاؤں۔ معاف کیجئے۔ میرے یہاں کے قیام سے آپ کی نئی خانگی زندگی میں خلل تو واقع نہ ہوگا؟

شمیم بولی۔

میری خانگی زندگی؟

فرید نے کہا۔

یہ مکان چونکہ صرف ایک ہی فیملی کے لائق ہے۔ اس لئے مجھے اندیشہ ہے کہ اگر آپ کو نہیں تو آپ کے دولہا کو میرا

قیام کہیں شاق نہ گزرے۔

سشمی کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ احمق اب بھی یہی سمجھے بیٹھا ہے۔ آخر کس بناء پر اس نے یہ نامطبوع خیال قائم کیا ہے۔ سشمی نہیں سے سخت رہی تھی۔

فرید نے سادگی سے کہا۔

یہ تینوں کمرے تو ماموں اور ممانی کے قبضے میں ہیں۔ وہ دو کمرے آپ دونوں کے تصرف میں ہوں گے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ میں اپنا اسباب نشست میں لے جا کر رکھ دوں۔

آخر سشمی نے فرید کے تکلیف دہ مغالطے سے جبل کر کہا۔

میرے خیال میں آپ اپنا اسباب سڑک پر لے جا رکھ دیں تو اچھا ہو گا۔

فرید نے کہا۔

خفا نہ ہوں سشمی صاحبہ! میں تو پرسوں واپس لاہور چلا جاؤں گا اور اگر آپ کے شوہر صاحب کو بھی میرے قیام سے تکلیف ہوئی تو ماموں اور ممانی سے کچھ عذر کر کے ہوٹل

میں منتقل ہو جاؤں گا۔ مطمئن رہیئے۔
وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ شمی اپنی سابقہ رکھائی کی عادت کے تحت بات کر رہی ہے۔
آخر بار بار شوہر کا ذکر کر کے شمی کو فہمائش کرنی پڑی۔
دیکھئے فرید صاحب! مجھے اس قسم کی باتیں پسند نہیں۔
فرید نے کہا۔
کیا ہوا شمی صاحبہ! کیا کہا میں نے؟ اگر نادانستہ کوئی ناگوار لفظ میرے منہ سے نکل گیا ہو تو ندامت سے معذرت خواہ ہوں۔
شمی نے کہا۔
آپ خود غور کیجئے۔ کیا کہہ چکے ہیں آپ؟
فرید نے غور کرنا شروع کیا مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔
فرید نے کہا۔
معاف کیجئے۔ بعد غور بھی میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ البتہ آپ کے شوہر صاحب کا ذکر میری زبان پر آیا تھا مگر ان

کے لیے بھی کوئی ناشائستہ لفظ میں نے ادا نہیں کیا تھا۔
شمی بھتا کر چپ ہو گئی۔

ایک طرف شمی کچھ خفا سی تھی۔ دوسری طرف فرید اس کے معمّوں سے پریشان عجیب جھنجلاہٹ پیدا ہو گئی تھی اور یہ جھنجلاہٹ خود فرید کی پیدا کی ہوئی تھی۔ اس کے پاس یہ قیاس قائم کرنے کا کون سا ذریعہ پیدا ہو گیا تھا کہ شمی کی شادی ہو گئی ہے۔ یہ تو کوئی بات نہ تھی کہ اس کی پانچ سالہ غیر حاضری میں شمی کی شادی ضرور ہو گئی ہو۔

یا اس روز نیاز نامی کسی شخص کا نام سن کر شمی نے ناک بھوں چڑھائی تھی مگر یہ کیا ضروری تھا کہ نیاز شمی ہی کے

کسی مفروضہ شوہر کا نام تھا اور اس میں بھی کوئی عقل کی بات نہ تھی کہ شمی تو اپنے شوہر کا نام سن کر ضرور ہی چڑھ جانا لازم تھا۔

یہ سب کچھ دراصل فرید کی دیرینہ یاس کی کرشمہ سازی تھی۔ یا ممکن ہے باطنی طور پر وہ شمی کی سیکس سے اتنا مرعوب تھا کہ اس کے سامنے الٹی سیدھی ہانکنے لگتا تھا۔

آخر شمی کو کہنا پڑا۔

کیا آپ نے دو تین بار شوہر کی رٹ نہیں لگائی تھی۔

فرید نے کہا۔

ہاں! لیکن یہ اعزاز میں نے اپنی ذات کے لئے تو لینے کی جرأت نہیں کی تھی بلکہ جس خوش نصیب کے حصہ میں یہ نعمت آچکی ہے۔ اسی سے تو لفظ شوہر کو میں نے منسوب رکھا تھا۔

اس کے احمقانہ جواب سے شمی کا پارہ پھر چڑھنے لگا مگر ضبط کر گئی۔

شمی نے اس کی خبر لیتے ہوئے کہا۔

کیا آپ کو ایسی پر مبالغہ و پر مغالطہ نسبت کا رُخ

میری ذات کی جرح کرنا لازم تھا؟

اب تو فرید چکرایا۔ کیا واقعی اسے مغالطہ ہو رہا ہے اور اس کا قیاس سرے ہی سے بے بنیاد ہے۔ وہ نیم پریشانی اور نیم مسرت سے سوچنے لگا۔

اس نے دلیرانہ دار دریافت کیا۔

اچھا تو کیا شمی تمہاری اب تک شادی نہیں ہوئی ہے؟

اور اس پر دیرینہ والہیت طاری ہو گئی۔

شمی بولی۔ اب اس کے لہجہ میں حرارت نہ تھی۔

آپ کو کیا مجھ سے اس قسم کا سوال کرنا چاہیئے؟

نہیں کرنا چاہیئے مگر کرنے پر مجبور ہوں۔ فرید نے جواب دیا

شمی نے دریافت کیا۔

کیوں؟

فرید نے کہا۔

اس سوال کا جواب دینا میرے امکان میں نہیں کیونکہ اس کا تعلق میرے دل سے ہے۔ کچھ آج سے نہیں بلکہ سات سال سے۔

شمی خاموش ہو گئی۔

شمی بولی۔

اچھا! جائیے بیٹھ گئے آپ؟

فرید نے کہا۔

نہیں بلکہ گفتگو جاری رہے تو اچھا ہے کیونکہ ممکن ہے پھر مجھے سر اٹھانے تک کی مہلت نہ ملے۔ شکر ہے کہ اچھا زمانہ آگیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میری حقیر ذات کے سامنے بھی ملک و قوم کی آزادانہ خدمت کی راہیں کھل گئی ہیں۔ اس لئے شاید میں گم ہو جاؤں۔

فرید نے پھر کہا۔

شمی! اب میں تکلف سے تمہیں شمیم صاحبہ نہیں کہوں گا۔ ناگوار تو نہیں گزرے گا تمہیں؟

شمی نے جواب دیا۔

آپ کی زبان کو کون روک سکتا ہے۔

فرید نے کہا۔

تم۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ مجھ پر تم کو کس قدر قدرت حاصل ہے۔

فرید نے جانے کے لئے اٹھ کر کہا۔

بارِ خاطر ہو رہا ہوں۔ اچھا اب رات کو کھانے پر ہی آؤں گا امید ہے کہ تمہارے مفروضہ شوہر کو نہیں پاؤں گا۔ میں کس قدر احمق تھا۔ معاذ اللہ! اپنے اس مغالطہ پر ہنسی بھی آتی ہے اور غصہ بھی کہ تمہیں شادی شدہ سمجھنے لگا تھا۔

شمی نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

بیٹھیے! امی اور ابا بھی اب آیا ہی چاہتے ہوں گے۔

فرید نے جاتے ہوئے کہا۔

بس اب رات ہی کو آؤں گا۔

شمی نے کہا۔

اچھا! چائے تو پیتے جائیے۔ ایک دو منٹ میں تیار ہو جائے گی۔

اور لپک کر باورچی خانہ میں چلی گئی۔ فرید بھی رُکتے رُکتے وہاں جا پہنچا۔

شمی نے پلٹ کر آہستہ سے کہا۔

آپ اسی کمرے میں چلے جائیے۔

فرید نے تعمیل کی۔

جاتے ہوئے فرید سے شمی نے پوچھا۔

سنئے! کچھ کھائیں گے؟

فرید مسکرا کر بولا۔

شکریہ! ڈانٹ کھا تو لی۔

اور کمرے میں آگیا مگر ماما وہاں صفائی کر رہی تھی۔

ملازمہ نے فرید سے کہا۔

میاں! باہر باغیچہ میں جا بیٹھئے نہ۔ وہاں ہوا بھی ہے اور تازگی بھی۔

فرید نے کہا۔

شکریہ! آج مجھے یہ تمام مکان باغیچہ معلوم ہو رہا ہے اور میں ہر طرف تازگی پا رہا ہوں۔

خلافِ معمول شمی کو مہربان پا کر وہ بہت خوش تھا اور سب کا شکریہ ادا کئے جا رہا تھا۔

بہر حال فرید کھانے کے کمرے میں جا بیٹھا۔ وہ چاہتا تھا کہ شمی کے کمرے ہی براجمان رہے مگر وہاں صفائی ہو رہی تھی۔

کمرے میں فرید کو نہ پا کر شمی نے ملازمہ سے دریافت کیا۔ اس کے ہاتھ میں چائے کی کشتی تھی۔

Vyas 23/9/63

کیا چلے گئے بھائی فرید؟
ملازمہ نے کہا۔
نہیں کھانے کے کمرے میں ہیں۔ لائیے میں کشتی
لے چلوں۔
شمی نے کہا اور ڈرائینگ روم میں آگئی۔
تمہارے ہاتھ خراب ہورہے ہیں۔ میں ہی لے جاتی
ہوں۔
شمی کو کشتی ہاتھ میں لیے دیکھ کر فرید سروقد تعظیم بجا
لایا اور اس کے ہاتھ سے کشتی لے لی۔
فرید نے کہا۔
اتنے اہتمام کی کیا ضرورت تھی شمی! صرف چائے
کافی تھی۔
شمی نے چائے کافی کے جوڑ پر مسکرا کر کہا اور فرید کو
پیالی پیش کی۔
میں کافی لائی ہوں۔
شمی نے دریافت کیا۔
آپ اس انقلاب احسن کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں

بھائی فرید؟

فرید نے کہا۔

لفظِ احسن ہی سے ظاہر ہے کہ یہ تعمیری انقلاب ہے جس نے قوم و ملک کو تباہی سے بروقت بچا لیا۔ بہرحال اس کے متعلق شب کو ہم سب بیٹھ کر تبادلۂ خیال کریں گے۔

شمی نے سوال کیا۔

اچھا! یورپ میں آپ کی زندگی کا اہم ترین کیا واقعہ رہا ہے۔

فرید ذرا خاموش ہو گیا۔

فرید نے جواب دیا۔

کوئی خاص نہیں شمی! کیونکہ کسی واقعہ کی اہمیت تنہا اس کے وقوع پذیر ہونے پر نہیں ہے بلکہ انسان کے اپنے تاثر سے بھی اس کا تعلق ہے۔ چنانچہ شاید تم بھی سن کر تعجب ہوگا کہ باہر میں ہما ہمی کی زندگی میں گھرا ہوا رہنے کے باوجود اتنی مدت کے بعد یہاں آنے تک خود کو ایک قائم تاثر سے خالی نہ پاتا رہا۔

شمی نے اس تاثر کے متعلق سوال نہیں کیا۔
فرید نے عصرانہ سے فارغ ہو کر کہا۔
اچھا! اب اجازت چاہتا ہوں۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔
شمی نے کہا۔
اب تو امی اور ابا آنے ہی والے ہوں گے۔
اس کا مقصد یہ تھا کہ تھوڑی دیر اور رک جائے۔
رات ہی کو ان سے ملاقات ہوگی۔ شمی! تمہیں معلوم ہے۔ عبید اور اس کے والد کا مع اپنے گروہ کے کیا حشر ہوا؟
شمی نے جواب دیا۔
جی ہاں! اس کا سہرا ابا کے سر ہے۔ انہی سے تفصیل معلوم ہوئی تھی۔
فرید جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔
فرید نے چلتے چلتے پوچھا۔
شمی! ایک نام جو اس گھر میں پہلی بار میں نے سنا تھا وہ کس شخص کا ہے۔ یہ نیاز کون ہے؟

اس کے جواب میں شمی خاموش ہو گئی۔ فرید
مسکراتا ہوا چلا گیا۔

رات کو فرید کھانے پر اپنے ماموں کے ہاں کافی دیر سے پہنچا۔ سب اس کا انتظار کر رہے تھے۔ فرید کا خیال تھا کہ اس کے اعزاز میں کہیں جاوید نے اور مہمانوں کو بھی دعوت نہ دی ہو۔ اسے مسرت ہوئی کہ مکان پر سوائے گھر کے افراد کے کوئی غیر نہ تھا۔

فرید نے کہا۔

مجھے بہت افسوس ہے ماموں جان! آپ سے بھی معذرت خواہ ہوں بھائی صاحبہ! لیکن دیکھا جائے تو میری اس

دیر کی ذمہ دار شمی ہیں۔

جاوید نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر کہا۔

اچھا! تم نے ابھی سے شمی کا نام بے تکلفانہ لینا شروع کر دیا۔

صفیہ بھی مسکرائی۔

فرید نے کہا۔

انہوں نے مجھے شام کو اس قدر کھلا پلا دیا تھا کہ رات کے کھانے سے کچھ بے نیاز سا ہو گیا (نیاز کی وجہ سے فرید نے بے نیاز قصداً ادا کیا تھا تا کہ شمی کو چھیڑے) ترکیب تو اچھی چلی تھی شمی نے۔

صفیہ نے کہا۔

شاید ناشتہ ہضم کرنے کے لئے تم میلوں کا سفر طے کر کے آ رہے ہو اب۔

فرید نے کہا۔

سب سے زیادہ بھوک شاید شمی کو لگ رہی ہو گی۔ ان کا منہ اترا ہوا نظر آ رہا ہے۔

صفیہ نے کہا۔

مجھے تو اس کا منہ چڑھا ہوا نظر آرہا ہے۔

جاوید بولا۔

نہیں تو اُلٹا نظر آتا ہے۔ مسکرا تو رہی ہے شمی!

باورچی نے آکر اطلاع کی۔

کھانا چن دیا گیا ہے بیگم صاحبہ!

چنانچہ سب کھانے کے کمرے میں آ گئے۔

فرید نے کھانے کے دوران میں کہا۔

اس نئے انقلاب کے بعد فوجی حکام کے سامنے کس قدر اہم کام آگئے ہیں۔

جاوید نے کہا۔

بے حد۔ یوں کہنا چاہیئے کہ آٹھ نو سال سے کچھ کام ہی نہیں ہوا۔ کام کا آغاز تو اب ہو گا۔

شمی بولی۔

لیکن مجھے یہ بات پسند نہیں آئی کہ فوجیوں نے پرانے تمام گنہگاروں کو بخش دیا۔

فرید نے کہا

اگر اس کے برعکس کیا جاتا شمی تو خطرہ تھا کہ شکست

در بخت کے سلسلہ میں کچھ اینٹیں تو ہم پر بھی ضرور گر پڑتیں۔
شمی نے فرید سے دریافت کیا۔
آپ کا یہ مقصد کہ کچھ کشت و خون ہو جاتا!
فرید نے مسکرا کر کہا۔
کشت و خون تو کیا یہ سمجھو کہ اس انقلاب کا نام پھر انقلاب بلا خونریزی نہ رہتا۔ دوسری بات یہ کہ ابھی تِلوں میں سے تیل بھی تو نکالنا ہے۔
صفیہ مسکرا کر بولی۔
بہت سا تیل تو تمہارے ماموں ہی تِلوں میں سے نکال چکے ہیں۔
جاوید نے کہا۔
مگر میں نے وہ تمام تیل حکومت کے کولہو کے سپرد کر دیئے۔
شمی نے کہا۔
لیکن فوج والوں کو اتنی جلدی کا ہے کی ہے کہ کبھی تو جلد جمہوریت بحال کر دینے کا اعلان کر دیتے ہیں

کبھی نئے آئین کا۔ اگر ایسی ہی عجلت سے کام لیا گیا تو تمام کیا کرایا خاک میں مل جائے گا۔ آپ دیکھتے نہیں کہ ذرا مارشل لاء ڈھیلا ہوتا ہے تو تخریبی عناصر پھر فوراً سر ابھارنے لگتے ہیں۔ اس کیچڑ کو بھی ایک طویل دھوپ کی ضرورت ہے تاکہ تمام کیڑے مر جائیں۔

فرید نے کہا۔

اس کی میں بھی تائید کرتا ہوں مگر ہم پر کچھ مغربی ممالک کی آراء کا دباؤ پڑ رہا ہے لیکن ہمیں اس کی مطلق پرواہ نہیں کرنا چاہیئے۔ باہر کے ملک ہمارے مسائل کو نہیں سمجھ سکتے۔ خود امریکہ اور برطانیہ میں حقیقی جمہوریت مفقود ہے کیونکہ وہاں کالے اور گورے کی کشمکش موجود ہے اور ہندوستان کی جمہوریت تو اس قدر مسخ ہے کہ اس کا زندہ ثبوت وہاں کی اقلیتیں ہیں۔

جاوید نے کہا۔

ایشیائی ممالک بالخصوص پاکستان میں جمہوریت کا اس وقت تک نام نہیں لینا چاہیئے۔ جب تک کم از کم پچاس فی صدی خواندہ افراد کی تعداد نہ ہو جائے اور نہ یہاں ڈکٹیٹر

شپ راس آسکتی ہے بلکہ ہمیں رہبر حکمرانوں کی سخت ضرورت ہے ۔ ان کی اور ہماری زندگی میں اشتراک کامل ہونا چاہیئے۔ مسرت ہے کہ ایسے دور میں آغاز ہو رہا ہے ۔

سمتی نے کہا۔

جمہوریت کو کامیاب بنانے کے لئے بے شک تقریباً نصف سے زیادہ قوم کا خواندہ ہونا نہایت ضروری ہے مگر اس کے ساتھ ہی مکمل شہری حقوق بھی قوم کو ملنے چاہئیں جیسا کہ سوئٹزرلینڈ وغیرہ میں ہے ورنہ ــــــ از منفرد و صد خرف کر السنانی نمی آید والا مضمون رہے گا ۔

صفیہ نے کہا۔

تقریباً یہی کیفیت ہم مسلمانوں کے اسلام کی ہے۔ کروڑوں مسلمان تحت الشعور میں لادین سے ہو چکے ہیں۔ اس صورت میں اگر ان کے سپرد اسلامی نظام کر دیا جائے تو کیا یہ لنگڑے گدھے اس وزن کو سنبھال سکیں گے۔ پاکستان میں سن انیس سو تریپن سے لے کر سن اکیاون کے اواخر

تک ہم نے اسلامی جمہوریت کے خوب تماشے دیکھ لئے معاذ اللہ! اس دور میں اسلام کے نام پر خدا کے اس مقدس دین کی کس قدر سفاکانہ توہین کی گئی ہے۔ وجہ؟ یہی کہ لادین قوم اس پاک مشن کی اہل نہیں ہو سکتی۔ یہی صورت جمہوریت کی سمجھئے۔ یہ بھی بچوں کے ہاتھ میں ننگی تلوار دینا ہے۔

جاوید نے کہا۔

تم سب اپنی تجاویز اس طرح پیش کر رہے ہو، جیسے پریس کانفرنس ہو رہی ہو۔ اطمینان رکھو۔ نئی حکومت میں ہر چیز عوام کے فائدے اور ملک کے بھلے ہی کے لئے ہو گی۔

شمی نے کہا۔

لیکن ابا! سب سے پہلے ایک یہ کام ہونا چاہئیے کہ ملک میں طبقاتی امتیازات یکسر ختم کر دیئے جائیں۔ اس طرح جو سوسائٹی پیدا ہو گی وہ عین اسلامی ہو گی اور پھر اس سے جو نظام اٹھے گا وہ بھی اسلامی ہو گا۔ ہونا یہ چاہئیے کہ عید کے موقع پر یا جشن آزادی پر

کار میں بیٹھنے والے رکشا اور گاڑی والوں سے گلے ملیں حکام عوام کو سلام کرنے میں تقدیم کریں اور غریبوں کی تقاریب اور ان کی بیویوں کی زچگی، موت، شادی وغیرہ میں افسروں اور متمول لوگوں کی بیویاں شرکت کریں غرض ایک مساوات کا دور دورہ ہو تا کہ پس ماندہ و افتادہ طبقہ میں احساس دوازوں بخشی و احساس کمتری بالکل ختم ہو جائے۔ اس کے بعد جو قوم پیدا ہو گی وہ اپنی یک جہتی و اتحاد کی وجہ سے فولاد سے بھی زیادہ وزنی ہو گی۔

جاوید نے کہا۔

انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا مگر خیرات گھر سے شروع ہونا چاہیئے۔ اس لئے تم اور تمہاری والدہ کل ہی سے اپنے محلے کی غریب عورتوں کی خدمت میں لگ جاؤ۔

صفیہ بولی۔

میں تو اسی وقت تیار ہوں۔

جاوید نے مسکرا کر کہا۔

اور فرید تو عبید کا دوست ہونے کے باوجود کئی سال سے ملکی رفاہ کے کاموں میں مصروف ہیں۔

فرید نے حیرت سے کہا۔

میں عبید کا دوست ماموں جان!

صفیہ ہنسنے لگی۔

جاوید کا اشارہ فرید کے بارے میں شمی کے اگلے مغالطہ کی طرف تھا۔

جاوید اسی طرح مسکرا کر بولا۔

بھئی! مجھ سے اور تمہاری ممانی سے تو شمی نے یہی کہا تھا۔

اب شمی بھی اس اشارے کو سمجھ گئی اور جز بز ہونے لگی۔

فرید کی زبان سے نکلا۔

اچھا! سخت حیرت!! کیوں شمی؟

اور اس کی آنکھوں میں شدید شکایت کے آثار پیدا ہو گئے۔

شمی نے کچھ جواب نہیں دیا۔

فرید نے اندوہ سے کہا۔
شمی خدا کے واسطے مجھے بھی تو بتائیے۔ آخر آپ
کو یہ مغالطہ کس بنا پر ہوا کہ عبید میرا دوست ہے۔
آخر شمی نے زبان کھولی۔
جی ہاں! یہ مغالطہ ہی تھا جسے میں مدّت ہوئی،
رفع کر چکی۔ اب امّی اور ابّا اس کا ذکر کر کے مجھے فقط
چھیڑ رہے ہیں۔
فرید نے مسرت سے کہا۔
خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تمہارا یہ افسوسناک مغالطہ
رفع ہو گیا۔
جاوید نے مسکرا کر کہا۔
تمہیں ایک معاملہ میں تو اللہ میاں کے آگے شکر
گزاری کے طور پر سربسجود ہو جانا چاہیئے فرید۔
صفیہ بھی ہنستی ہوئی بولی۔
ہاں! وہ بھی آج کہہ ڈالیئے۔
اب شمی کسمسانے لگی کہ نامعلوم اس کے والدین کیا
کہنے والے ہیں۔

جاوید نے کہا۔

مگر اس کے لئے فرید کو مٹھائی کا وعدہ کرنا پڑے گا۔

فرید نے مسکرا کر کہا۔

اب رشوت کی گرم بازاری ختم ہوئی ماموں۔ میں آپ کو مٹھائی کی رشوت نہیں دے سکتا۔

صفیہ نے ہنس کر کہا۔

بس تو منہ دھو رکھو تم بھی۔

جاوید نے کہا۔

خیر سن لو تم بھی کیا یاد کرو گے۔ شمی کے دل سے تمہارے متعلق مغالطہ دُور ہوتے ہی اس پر سخت ندامت طاری ہو گئی تھی کہ تم جیسے ناکردہ گناہ کو اس نے ایک مجرم کا شریکِ کار کیوں سمجھا تھا۔ یہ پانچ سال پہلے کی بات ہے جب تم ولایت کے لئے روانہ ہوئے تھے۔

جاوید نے کہا۔

میں شمی کی اس ندامت کی دل و جان سے قدر

کرتا ہوں۔

جاوید نے مسکرا کر کہا۔

اور تمہیں شمی کی بھی دل و جان سے قدر کرنا چاہیئے
کیونکہ وہ پانچ ساڑھے پانچ سال سے تمہارے ہی نام پر
بیٹھی ہوئی ہے۔ یہ اس جیسی خوددار لڑکی کے لئے بہت
بڑی بات ہے۔ بہرحال اس دوران میں اس کی شادی
کے اچھے اچھے پیغامات آتے رہے مگر اس
نے ان سب کو ٹھکرا دیا۔

صفیہ بیٹھی ہوئی ہنستی رہی مگر شمی تلملاتی ہوئی اُٹھ کر
چل دی۔

فرید نے اس کے پیچھے لپکتے ہوئے کہا۔

شمیم صاحبہ! میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔

جاوید نے فرید کو ڈانٹ بتاتے ہوئے کہا۔

خبردار! آگے نہ بڑھیے!

اسے رُک جانا پڑا۔

صفیہ نے [illegible] کی برکت تھی کہ
ہر گھر سے [illegible] لگی تھیں۔

[illegible]